حجاج بن یوسف

حقائق کے آئینہ میں

حجاج مرحوم کے دو احسانات پوری امت مسلمہ پر ایسے ہیں جن کے بار سے سبکدوش ہونا اس کے لئے ممکن نہیں۔ ان میں سے ایک قران کریم پر اعراب لگوا کر اس کی حفاظت اور اس کی اشاعت کرنا ہے۔ دوسرا سر زمین ہندوستان تک اسلام پہنچانا ہے۔ آج پاک و ہند میں ہمارا کلمہ گو ہونا حجاج ہی کی مساعی کا مرہون منت ہے۔ یہ حجاج کے ایسے احسانات عظیمہ ہیں جن کی وجہ سے دشمنانِ قرآن اور دشمنانِ اسلام ان کے سخت دشمن بن گئے اور انہیں غلط اور لغو اعتراضات کا نشانہ بنایا!

ماخوذ از

"اظہار حقیقت" (جلد سوم)

مفکر اسلام مولانا محمد اسحٰق صدیقی ندوی

سابق شیخ الحدیث و مہتمم دار العلوم' ندوۃ العلما' لکھنؤ

ناشر کتاب: اسلامی کتب خانہ' علامہ بنوری ٹاؤن۔ کراچی نمبر ۵

فہرست مضامین

نوٹ : حجاج کے بارے میں یہ بھی ایک غلط قصہ مشہور کر دیا گیا کہ جب وہ عراق کا گورنر تھا تو اسے بتایا گیا کہ وہاں کچھ مستجاب الدعوات لوگ ہیں اس لئے وہ ان پر ظلم سے پرہیز کرے۔ چنانچہ حجاج نے ایک حیلے سے ان لوگوں کو دعوت پر بلایا اور یتیموں کا مال (یعنی مال ناحق) انہیں کھلا دیا اور پھر مشتہر کر دیا کہ اب وہ لاکھ اس کے حق میں بد دعائیں کریں وہ قبول نہ ہوں گی کیونکہ حرام کی غذا ان کا جزو بدن بن چکی ہے۔

یہ قصہ سب من گھڑت اور لغو ہے اور فقط حجاج کو بدنام کرنے کے لئے شیعوں نے پھیلا دیا۔

تعارف

حجاج بن یوسف دور بنو امیہ کا نہ صرف ایک بڑا سیاستدان اور مدبر تھا بلکہ وہ بنو امیہ کا سب سے مشہور و لائق ترین گورنر تھا۔ وہ طائف میں ۴۱ھ کے لگ بھگ پیدا ہوا اور ۹۵ ہجری میں راہی ملک عدم ہوا۔

خارجیوں کی مسلسل سازشوں کے باعث عراق کی گورنری اسلامی ریاست کا سب سے اہم اور ذمہ دارانہ انتظامی عہدہ تھا۔ حجاج کو ۳۳ برس کی عمر میں (۷۵ھ کے آغاز میں) خلیفہ عبد الملک کے عہد خلافت میں اس عہدہ پر فائز ہونے کا موقع ملا۔ اس پر پہلے وہ دو سال تک حجاز کا گورنر بھی رہ چکا تھا۔

اسلامی ریاست کے مشرق میں خلیفہ ولید بن عبد الملک کے زمانے کی شاندار فتوحات بھی حجاج کی مساعی اور انقلابی جنگی تدبیروں کی مرہون منت تھیں۔ ماوراء النہر (قدیم ترکستان کا علاقہ) کو قتیبہ بن مسلم، عمان کو مجاعہ بن مسعر اور ہندوستان کو محمد بن قاسم نے فتح کیا۔ اسلامی فتوحات کے اس عہد زرین کے ان تین ممتاز سپہ سالاروں کو حجاج بن یوسف کی عقابی نگاہوں نے مذکورہ مہمات کے لئے منتخب کیا اور ان کی صلاحیتوں اور لیاقت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جس کی بدولت اس عہد کی اسلامی حکومت کو خوب قوت ملی۔ حجاج بن یوسف ایک مستعد اور زود فہم حکمران تھا وہ ملک کی خوشحالی میں اضافہ کرنے کے لئے ہمیشہ فکر مند رہتا تھا اور خلیفہ عبد الملک اور ولید بن عبد الملک کے عہد میں اس نے اسلامی ریاست کی فلاح و بہبود اور استحکام کے لئے مثالی خدمات سرانجام دیں۔

ہمارے ہاں حجاج کے ظلم و جور کے بارے میں جو داستانیں مشہور ہیں وہ بے اصل اور شیعوں کی وضع کردہ ہیں۔ مسلمانوں کو اصل حقائق سے آگاہ کرنے کے لئے مفکر اسلام مولانا محمد اسحٰق صدیقی ندوی کی تحقیق سے اخذ شدہ مواد اس کتابچہ کی صورت میں پیش کیا جارہا ہے تاکہ عوام و خواص اس سے استفادہ کر سکیں اور نتیجتاً اسلاف کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے اور ہمارے دلوں میں ان کی عظمت بحال ہو سکے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

عبدالرحمٰن، ناشر کتابچہ ہذا

۱۵ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ

حجاج کے خلاف الزامات کا تحقیقی جائزہ

(ماخوذ از "اظہار حقیقت")

سبائیوں (ابن سبا کے پیروکار یعنی شیعوں) نے حجاج بن یوسف پر ظلم و ستم کا الزام لگایا اور اس کی اس قدر تشہیر کی کہ سنی بھی انہیں ظالم کہنے لگے۔ ان کا نام ظلم و ستم کی علامت بنا دیا گیا۔ اس تشہیر بہتان کو شیعوں اور شیعیت نوازوں نے بنو امیہ کے خلاف عوام و خواص کو مشتعل کرنے کا ذریعہ بنایا۔ چنانچہ امیر المومنین عبدالملک رحمہ اللہ نے اپنی اولاد کو جو وصیت حجاج مرحوم کی قدر شناسی اور ان سے حسن سلوک کے متعلق کی تھی اس کا تذکرہ کر کے مودودی صاحب لکھتے ہیں:۔

"یہ وصیت اس ذہنیت کی پوری نمائندگی کرتی ہے جس کے ساتھ یہ لوگ حکومت کر رہے تھے۔" (خلافت ملوکیت، ص ۱۸۶)

مگر یہ عمارت ظلم کے اسی غلط پروپیگنڈے' اور جھوٹ کی ریت پر قائم کی گئی ہے' جس کا ڈھیر سبائیوں اور سبائیت نوازوں نے لگایا ہے۔ اس لئے حقیقت ظاہر ہونے کے بعد یہ پوری عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔ غلط بیانی اور اس میں مبالغہ آرائی کا ایک نمونہ مودودی صاحب کا مندرجہ ذیل قول ہے:

"اس کے زمانہ میں جو لوگ قید کی حالت میں کسی عدالتی فیصلے کے بغیر قتل کئے گئے صرف ان کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار بتائی جاتی ہے جب وہ مرا ہے تو اس کے قید خانوں میں ۸۰ ہزار بے قصور انسان کسی مقدمے اور کسی عدالتی فیصلے کے بغیر سڑ رہے تھے۔" (ص ۱۸۶)

○ تبصرہ:۔ اس غلط بیانی کے لئے "الاستیعاب ج ۱" کا حوالہ دیا گیا ہے۔ الاستیعاب کے متعلق جلد اول میں دکھا چکا ہوں کہ قابل اعتماد کتاب نہیں۔ اکابر علماء قدیم نے بھی اسے قابل اعتماد نہیں سمجھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کے مصنف حافظ ابن عبدالبرؒ کے ذہن پر شیعیت کا خاصا اثر تھا۔ اور وہ بنو امیہ سے دلی پرخاش رکھتے تھے' اس لئے ان کے خلاف روافض کی روایتیں بلا تکلف قبول کر کے نقل کر دیتے تھے۔ اس معاملے میں نہ تو وہ خود قابل اعتماد ہیں اور نہ ان کی کتاب۔ مجہول کے صیغوں "قیل" "یقال" "اور بتائی جاتی ہے" کہہ کر ہر جھوٹ نقل کیا جا سکتا ہے۔ مگر اہل بصیرت ایسی کہانیوں اور افواہوں کا؟

اعتبار نہیں کرتے ۔ خصوصاً جو بعید از قیاس ہوں ' ان کی صحت کا شبہ اور احتمال بھی کسی فہیم انسان کو نہیں پیدا ہوتا ۔ زیر بحث روایت تو اگر ثقات کی سند متصل کے ساتھ بھی ذکر کی جاتی تو بھی قابل قبول نہ ہوتی ' بلکہ فہم سلیم کے نزدیک مردود اور جھوٹی قرار پاتی ۔

اس سوال کا جواب کیا ہے کہ یہ مقتول شماری کس نے کی ؟ اس زمانہ میں کوئی خبر رساں ایجنسی نہیں تھی ' نہ اخبارات تھے ' ڈاک ' تار ' فون وغیرہ ذرائع خبر رسانی بھی مفقود تھے ۔ سفر بھی آج کی طرح آسان نہیں تھا ۔ پھر اس سبائی روایت کے راوی کذاب نے مقتولین کی تعداد کیسے معلوم کرلی ؟ اور یہ کیسے معلوم کرلیا کہ یہ سب مقتولین ناحق ' بغیر کسی عدالتی فیصلے کے قتل کئے گئے تھے ؟ موجودہ زمانہ میں جبکہ رسل و رسائل اور حمل و نقل کے ذرائع بکثرت ہیں ' مشرق کی خبر مغرب تک منٹوں میں پہنچ سکتی ہے اور بعض اوقات پہنچتی ہے ۔ اگر کسی چھوٹے سے ملک میں ' بلکہ کسی بڑے شہر میں بھی سو دو سو آدمی قتل کئے جائیں تو خود اس شہر میں رہنے والوں کے لئے ان کی صحیح تعداد کا معلوم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے ۔ پھر اگر بالفرض یہ مقتولین پہلے سے قید ہوں تو یہ معلوم کرنا کہ انہیں عدالتی فیصلے کے بغیر قتل کیا گیا ہے یا اس کے فیصلے کے بعد اور بھی مشکل ہوتا ہے ۔ آج کل مختلف ممالک کے بڑے شہروں میں مختلف قسم کے ہنگامے ہوتے رہتے ہیں ۔ بعض صورتوں میں حکومت گولی چلاتی ہے ۔ مقتولین و مجروحین کی صحیح تعداد مدت دراز تک نہیں معلوم ہوتی ۔ بلکہ بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ صحیح تعداد کبھی نہیں معلوم ہوتی ۔ پھر حجاج مرحوم کے دور میں ایک وسیع و عریض صوبے میں ان مفروضہ مقتولین کی یہ تعداد ' اور ان کا بغیر عدالتی فیصلے کے قتل ہونا کیسے معلوم ہوگیا ؟ اس سوال کا کوئی اطمینان بخش جواب یہ دشمنان خلافت نہیں دے سکتے ۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ روایت بالکل جھوٹی ' موضوع اور جعلی ہے کسی رافضی دشمن خلافت کی گھڑی ہوئی ہے ' جس نے جھوٹ اور مبالغہ آرائی کو کو ممزوج کرکے حجاج مرحوم پر بہتان و افتراء کیا ہے ۔ ۸۰ ہزار قیدیوں کی روایت کو بھی اسی پر قیاس کرلیجیے یہ بھی جھوٹ کی پوٹ ہے ۔ یہ قیدی شماری کس نے کی ؟ اور کس کے بس کی بات تھی ؟ اگر حجاج ظالم تھے تو انہوں نے اس مقتول شماری اور قیدی شماری کرنے والے کی گردن کیوں نہ مار دی اور انہیں جیتا کیسے چھوڑ دیا ؟ یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ اموی خلافت کے زمانہ میں جیل خانوں کی تعداد بہت کم تھی اور اتنی وسیع و عریض جیل جیسی موجودہ زمانہ میں ہوتی ہے ۔ شاید ایک بھی نہ تھی ۔ سزائے قید کا رواج بہت کم تھا ۔ اگر یہ سزا دی جاتی تھی تو زیادہ تر مجرم کو خانہ قید کردیا جاتا تھا ۔ جسے ہمارے زمانہ میں نظر بندی کہتے ہیں ۔

یعنی ملزم اپنے گھر میں آزادی کے ساتھ رہتا۔ صرف گھر سے باہر جانے پر پابندی ہوتی تھی
پھر یہ ۸۰ ہزار قیدی آخر قید کہاں تھے ؟ اور ان کی گنجائش کہاں نکالی گئی تھی ؟

ان دروغ بافی راویوں اور دروغ نواز مورخوں کی سمجھ میں یہ بھی نہ آیا کہ ایک لاکھ بیس ہزار مقتولین اور اسی (۸۰) ہزار قیدیوں کا تذکرہ سن کر اس دور کی تاریخ اور عام انتظامی و سیاسی حالات سے معمولی واقفیت رکھنے والے کے دل میں بھی مندرجہ بالا سوالات پیدا ہوں گے۔ ان کا جواب تو ہونا چاہئے۔ لیکن عداوت بنی امیہ اور حب شیعت کے زہر کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے ان کا ذہن بھی ماؤف ہوگیا اور سوالات تک نہ پہنچ سکا۔

ورنہ کوئی اور روایت گڑھ دیتے اور جھوٹ کی تعداد میں اضافہ کردیتے۔

سبائیوں اور سبائیت نواز تاریخ نگاروں اور راویوں نے جھوٹ کیوں بولا ؟ اور مبالغہ آمیز کذب و دروغ کا اتنا بڑا ڈھیر کتب تاریخ میں کیوں لگادیا۔ اس کا علم بھی مفید ہے۔ جو لوگ تحریک شیعت ' اس کے مقاصد ' اور اس کے طریق کار سے واقف ہیں ان کے لئے اسے سمجھ لینا کچھ بھی مشکل نہیں۔ ابن سبا کی تعلیم یہ تھی کہ اگر شیعوں کی مفسدہ پردازی پر حکومت کوئی گرفت کرے تو اپنی مظلومیت کا رونا اونچی سے اونچی آواز میں رویا جائے اور معمولی سی بات کو سینکڑوں گنا کرکے دکھانے کے ساتھ اپنی معصومیت و بے گناہی کی جھوٹی تشہیر خوب کی جائے۔ یہ یہود کا بت اصولی عمل ہے۔ وہی انہوں نے شیعوں کو سکھایا ' شیعہ ہمیشہ اسی پر کاربند رہے اور اب بھی اسی پر کاربند ہیں۔

اموی خلافت کے مبارک دور میں خلافت اسلامیہ کے خلاف سبائیوں کی خفیہ سازشیں جاری تھیں۔ یہ مفسدین فی الارض " تقیہ " کا لبادہ اوڑھ کر اور " سنی " بن کر اسلام اور خلافت اسلامیہ کے خلاف طرح طرح کے دینی و دنیاوی فتنے برپا کرنے میں مصروف تھے۔ ایسے فتنہ پرداز منافق دشمنان اسلام ' جب گرفت میں آجاتے تھے تو حجاج مرحوم انہیں سزا دیتے تھے۔ اور یہ سزا شرعاً ' و اخلاقاً ' ہر طرح بالکل بجا اور درست ہوتی تھی۔ ایسے واقعات چند ہی ہیں۔ انہیں شیعوں اور شیعت نوازوں نے جھوٹ اور مبالغے کی آمیزش کرکے رائی کا پہاڑ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان مفسدوں کو جب سزا دی گئی تو قانون شرعی کے مطابق دی گئی۔ حجاج مرحوم کی گورنری کے پورے زمانہ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں پیش کیا جاسکتا جس میں انہوں نے کسی شخص کو اس کے جرم کے ثبوت شرعی کے بغیر سزا دی ہو۔ واضح رہے کہ کسی کے بارے میں ایسے سنگین الزام کے لئے بھی

ثبوت کی ضرورت ہے۔ خون ناحق کا الزام معمولی الزام نہیں ہے۔ حجاج ہوں یا اور کوئی ' کسی کو بھی اس جرم کا مرتکب ثابت کرنے کے لئے شرعی ثبوت کی احتیاج ہے۔ روایت کو سند اور درایت دونوں حیثیتوں سے جانچنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے۔ یہی نہیں بلکہ خود مورخ کے عقیدہ و کردار کو بھی ملحوظ رکھنا لازم ہے۔ مورخ بھی ایک راوی ہے۔ جب رواۃ پر نقد کیا جائے گا تو اسے نقد سے مستثنیٰ کیوں سمجھا جائے؟ مختصر یہ کہ حجاج مرحوم پر ظلم و جور کا الزام لگانے والوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس الزام کا ثبوت دیں۔ اور میں وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ حجاج مرحوم کے دور ولایت کا ایک واقعہ بھی ایسا نہیں پیش کرسکتے جس کے بارے میں وہ شرعی دلیل سے یہ ثابت کرسکیں کہ اس میں انہوں نے کسی کا خون ناحق بہایا تھا۔ صرف یہ کہہ دینا کہ فلاں مورخ اعظم نے یہ لکھا ہے ' یا فلاں شیخ المشائخ ' فلاں امام اہل سنت ' فلاں عمدۃ الاولیاء اور فلاں علامہ نے یہ لکھا ہے ' ثبوت کے لئے کافی نہیں۔ تاریخ اقوال و آراء کا نام نہیں۔ بلکہ نقل و روایت کا نام ہے۔ کسی تاریخی واقعہ کے ثبوت کے لئے نقل صحیح و قوی درکار ہے۔ نقل اقوال بالکل بیکار ہے۔

ممکن ہے کہ کسی معاملے میں ان سے نادانستہ غلطی بھی ہوئی ہو اور کسی غیر مجرم کو مجرم سمجھ کر انہوں نے سزا دی ہو۔ لیکن شیعوں اور شیعیت نوازوں خصوصا علوی فاطمی راویوں اور مورخوں نے اس قسم کے ایک واقعہ کو دس واقعات کرکے دکھایا ہے اور مجرموں کو بے گناہ ظاہر کرکے ان کی مظلومیت کا رونا رویا ہے۔ ان کذاب سبائیوں کے جھوٹے آنسوؤں سے متاثر ہو کر بعض سنی مورخین نے بھی ان کی مشہور کی ہوئی غلط افواہوں پر یقین کرلیا۔ بہت سے ایسے بھی ہیں جنہیں اس کا علم تھا کہ حجاج ان الزاموں سے بری ہیں لیکن حکومت یا علویہ کو خوش کرنے کے لئے یہ علماء و مورخین ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔ جیسے آج پاکستان اور بھارت کے متعدد صحافی اور سیاسی لیڈر ایران کی تعریف کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ بعض علماء بھی اس کی ستائش کرنے میں دریغ نہیں کرتے حالانکہ ایران نے انقلاب خمینی کے دور میں اور اس کے بعد سنیوں پر ایسے مظالم ڈھائے اور ڈھا رہا ہے کہ جنہیں سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ...... جتنا خون ناحق شاہ نے اپنے پورے دور سلطنت میں بہایا تھا اس سے دس گناہ زیادہ انسانوں کا خون ناحق خمینی ان آٹھ سالوں میں بہا چکا ہے اور ابھی اس کی خونخواری و خونریزی کا سلسلہ جاری ہے یہ شخص انسانوں خصوصاً مسلمانوں (اہل سنت) کے خون میں گلے گلے ڈوبا ہوا ہے.........

شیعہ مورخوں اور راویوں نے اسلامی تاریخ کو تاریک بنانے ' خلفاء اسلام ' ان کی

حکومتوں اور ان کے عمال کو بدنام کرنے کے لئے جھوٹ بولنے کے ساتھ مغالطہ دہی سے بھی خوب کام لیا ہے۔ اس مغالطہ دہی کی ایک مثال عبدالرحمان بن محمد بن اشعث کی بغاوت کا بیان بھی ہے یہاں اس پر کچھ روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس سے مخالفین بنی امیہ کی بیمار ذہنیت اور زیادہ واضح ہو جائے گی۔

ابن الاشعث کی بغاوت

عبدالرحمٰن بن محمد بن الاشعث حجاج کے زمانہ میں ایک فوجی آفیسر تھا آدمی تیز اور ذہین تھا عراق کا باشندہ تھا جہاں ایرانی سبائی خاصی بڑی تعداد میں رہتے تھے۔ عراق کے دو اہم شہر کوفہ اور بصرہ ان کے اہم مرکز تھے۔ یہ "تقیہ" کے غول میں پوشیدہ رہتے تھے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی خفیہ تدبیروں میں مصروف رہتے تھے۔ نفاق ان کا شعار اور خفیہ ساز باز ان کا اصول کار تھا۔ ابن الاشعث کے آخری کردار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی در حقیقت اسی گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر مدت دراز تک 'تقیہ' کی نقاب میں اپنا اصل چہرہ چھپائے رہا۔ مودودی صاحب نے اس کی بغاوت کے واقعہ کو اس طرح ذکر کیا ہے کہ گویا اس نے کوئی جہاد فی سبیل اللہ کیا ہو۔ حالانکہ علماء و مورخین اسلام نے عموما اس کی اس بغاوت کو "فتنہ ابن الاشعث" کے عنوان سے (بذیل حوادث ۸۰ ھ و ۸۲ ھ) ذکر کیا ہے اور اس کی بغاوت کے واقعہ پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ جس کی خلاصہ یہ ہے:

> "عبدالرحمان بن محمد بن الاشعث ایک فوجی افسر تھا۔ یہ عراق کا رہنے والا تھا۔ تیز جری اور ذہین آدمی تھا۔ حجاج نے اسے سجستان کا گورنر بنا کر بھیج دیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے قریب کے کافر ملک پر حملے شروع کر دیئے۔ ان بلاد و امصار کا والی ایک مشرک رتبیل نامی تھا۔ یہ حملے صرف سرحد تک محدود تھے۔ اور سرحدی چھیڑ چھاڑ کی حد سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ کچھ مدت کے بعد حجاج نے اسے لکھا کہ "رتبیل" کے ملک پر باقاعدہ حملہ کرے اور اندرون ملک تک فوجیں لے جا کر اس کی سرزمین کو فتح کرے۔ چونکہ حجاج سے اس کی مخالفت تھی (۱) اس لئے اس نے یہ کہا کہ اس نے اسے اس جنگ کا حکم اس لئے دیا ہے کہ اسے اور اس کے لشکر

---

(۱) عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث سے حجاجؒ مرحوم کے ناراض ہونے کی وجہ یہ تھی کہ

کو تباہ کروادے۔ اس نے اپنے لشکر والوں سے کہا کہ ہمارے پاس

بعض واقعات کی وجہ سے انہیں اس پر شبہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ خلافت اسلامیہ کے خلاف سازش کر رہا ہے اور اس کا رجحان غداری کی طرف ہے۔ ایک واقعہ تو یہ ہے کہ جب حجاجؒ نے اسے شبیب خارجی کے مقابلے میں بھیجا تو اس نے جنگ کرنے میں ڈھیل اور سستی سے کام لیا۔ ایک موقع پر جب شبیب پسپا ہو چکا تھا اور اس کی مکمل شکست قریب تھی۔ ابن الاشعث نے مقام جوخی میں قیام کر کے اس کی درخواست پر اس کے ساتھ التوائے جنگ کا معاہدہ کر لیا اور اسے جنگ کی تیاری کا موقع دے دیا۔ اس موقع پر عثمان بن قطن نے حجاجؒ کو اطلاع دی کہ "عبد الرحمٰن نے تمام علاقہ جوخی کو کھود کر ایک خندق بنا دیا ہے۔ شبیب کو تو چھوڑ دیا ہے مگر اس علاقہ کی مالگذاری اپنے خرچ میں لا رہا ہے اور باشندوں کو کھائے جاتا ہے" گویا وہ دیدہ دانستہ دشمن کو قوت حاصل کرنے کی مہلت دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ خیانت و ظلم کا بھی مرتکب ہو رہا تھا۔ (طبری مترجم احوال ۷۶ھ حصہ ۵ ص ۲۱۰)

مندرجہ ذیل واقعہ بھی اس کے ساتھ حجاجؒ کی بدگمانی کو جائز اور درست، ثابت کرتا ہے جس زمانہ میں وہ حجاجؒ کے حکم سے شبیب خارجی سے جنگ میں مصروف تھا اس زمانہ کا ایک واقعہ طبری لکھتا ہے۔

> "عبد الرحمٰن نے وہ رات دیر الیعار میں بسر کی۔ دو سوار آئے اور اس کے پاس کوٹھے پر چلے گئے۔ ایک شخص تو علیحدہ کھڑا ہو گیا اور ایک بہت دیر تک عبدالرحمان سے تنہائی میں باتیں کرتا رہا۔ پھر وہ اتر آیا اور اس کے دوسرے ساتھی بھی نیچے اتر آئے۔ بعد میں لوگوں نے بیان کیا کہ جو شخص عبد الرحمٰن سے باتیں کرتا رہا وہ شبیب تھا اور عبد الرحمٰن میں اور اس میں پہلے سے مراسلت ہوا کرتی تھی۔"
>
> (طبری مترجم حصہ ۵ ص ۲۲۶)

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خلافت کے دشمنوں سے مل گیا تھا اور خلافت کے خلاف ان سے ساز باز کر رہا تھا۔ غداری اسی کا نام ہے۔

اتنی قوت نہیں ہے کہ ہم رتبیل کے ملک پر حملہ کرسکیں اور اندرون ملک جاکر لڑ سکیں، حجاج نے ہمیں تباہ کرنے کے لئے یہ حکم دیا ہے۔ اس لئے مجھے امیر بنالو اور خلافت پر قبضہ کرو۔ حجاج اور عبدالملک دونوں کو ختم کردو۔ فوج اس پر راضی ہوگئی اور اس نے بغاوت کردی۔ اس کے ساتھ بہت سا لشکر ہوگیا اور اس نے بلاد اسلامیہ پر حملے شروع کردیئے۔ حجاج نے عبدالملک کو لکھا۔ اس نے ابن الاشعث کے مقابلے کے لئے شام سے لشکر بھیجا، جس نے اسے ہزیمت دی یہاں تک کہ "بست" کے مقام پر پہنچ کر اس کا لشکر منتشر ہوگیا اور "بست" کے عامل نے اسے قید کردیا۔ یہ واقعہ رتبیل، کو معلوم ہوا تو وہ اپنا لشکر لے کر "بست" پہنچا اور ابن الاشعث کو قید سے چھڑا کر اعزاز و اکرام کے ساتھ لے گیا۔" (۱)

علامہ ذہبی کے اس بیان پر نظر کرنے کے بعد یہ بات محتاج بیان نہیں رہتی کہ ابن الاشعث نے بغاوت بھی کی اور غداری بھی۔ اس نے خلافت اسلامیہ کے خلاف تلوار اٹھائی اور نظام خلافت کو ختم اور مسلمانوں کے ملی شیرازے کو پراگندہ کرنے کی ناپاک اور انتہائی مذموم کوشش کی۔ اس نے اسی پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ نہایت مکروہ قسم کی غداری بھی کی۔ وہ کافروں سے مل گیا اور انہیں اسلامی ملک پر مسلط کرنا چاہا۔ کافروں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کا خون بہایا اور اپنے کافر دوست "رتبیل" کی تحویل میں چلا گیا۔ اس طرح یہ غدار کافروں کا دوست اور مسلمانوں کا دشمن بن گیا۔ اس کا ناپاک کردار بتا رہا ہے کہ یہ یقیناً کوئی سبائی تھا جو اتنی مدت تک اپنی شیعیت کو تقیہ کی نقاب میں چھپائے رہا۔ موقع پاتے ہی اس نے امت مسلمہ پر وار کیا۔ اس کی اس بغاوت، غداری، عداوت خلافت اسلامیہ اور مسلم کشی کو علامہ ذہبی (اور عام طور پر علماء و مورخین) "فتنہ" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ مودودی صاحب اس کی اس حرب فی سبیل الطاغوت کو جہاد فی سبیل اللہ کا درجہ دیتے ہیں۔ العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ۔ اس سے ان مخالفین بنی امیہ و بنی عباس، کی ذہنیت کی پستی اور دروغ پسندی واضح ہوجاتی ہے۔ یہ حسد اور عداوت خلافت اسلامیہ کے جذبات سے مغلوب ہوکر حق و انصاف اور شریعت مقدسہ اسلامیہ کے احکام

---

(۱) تاریخ الاسلام و طبقات المشاہیر و الاعلام ص ۲۳۰ ج ۳۔ ناشر مکتبہ القومی القاہرہ مصر مطبعۃ السعادۃ ۱۳۶۸ھ

سب کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

علامہ ذہبی کے مندرجہ بالا بیان میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ "بست" کے مقام پر پہنچ کر اس کا لشکر منتشر ہو گیا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

وتفرق أصحاب ابن الاشعث "ابن الاشعث کے ساتھی اس سے جدا ہو گئے۔"

"بست" میں اس کے لشکر نے اسے چھوڑ دیا' اسی وجہ سے "بست" کے عامل نے اسے آسانی کے ساتھ گرفتار کر لیا۔

مودودی صاحب کہتے ہیں :۔ "ابن کثیر کا بیان ہے کہ قراء (یعنی علماء و فقہاء) کی ایک پوری رجمنٹ اس کے ساتھ تھی۔"

ان کے اس قول پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "قراء" کی یہ "رجمنٹ" کب سے اس کے ساتھ ہوئی تھی اور کب اس سے الگ ہو گئی؟ اتنا تو ماننا پڑے گا کہ "بست" کے مقام پر پہنچ کر اس کا سارا لشکر اس کا مخالف ہو کر اس کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ اس لئے مخالفین خلافت کو اتنا تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ "قراء" کی یہ نام نہاد "رجمنٹ" بھی اس سے الگ ہو گئی تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قراء جو بقول مودودی صاحب ابن الاشعث کی فساد انگیزی اور بغاوت و غداری کو "جہاد" ہونے کی سند دے رہے تھے اور جہاد ہی سمجھ کر اس میں شریک ہوئے تھے۔ جہاد سے "فرار" کے گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوئے یا نہیں؟ ہزاروں علماء کا اس طرح غدر کر کے بقول راوی "جہاد" سے "فرار" کی معصیت عظیمہ کا مرتکب ہونا تو بہت اہم اور عبرت خیز بات ہے' اگر ایسا ہوتا تو اس کا عام طور پر چرچا ہوتا۔ یقیناً تاریخ کے صفحات میں ملامت کے عنوان سے اس کا تذکرہ ہوتا۔ لیکن ہم تاریخ کے صفحات اس سے خالی پاتے ہیں۔ جن علماء و مشائخ کا نام اس سلسلہ میں آتا ہے مثلاً شعبی' ابن ابی لیلی' حسن بصری' و امثالہم ان کا تذکرہ کتب رجال میں دیکھئے تو ان میں بھی ان کی اس مبینہ معصیت کبیرہ کا کوئی تذکرہ نہیں ملے گا۔ مزید یہ کہ یہ سب حضرات اپنے وطن واپس آئے تو ان سے حجاج" یا عبدالملک" کسی نے بھی کوئی باز پرس نہیں کی اور ابن الاشعث کے ساتھ بغاوت میں شرکت' پر ان میں سے کسی کو بھی سزا نہیں دی۔ پھر ابن کثیر کے اس قول کو کس طرح صحیح سمجھا جا سکتا ہے۔ کہ "قراء" کی ایک پوری "رجمنٹ" باغی ہو کر ابن الاشعث کے ساتھ غدر و بغاوت' میں شریک ہو گئی تھی۔ ان کے قول کی صحت کی صرف یہ صورت ہے کہ اس سے مراد ان کی ابتدائی شرکت ہو۔ یعنی جب ابن الاشعث بحکم حجاج جہاد کے لئے روانہ ہوا تھا تو یہ سب

حضرات علماء کفار سے جہاد کرنے کے لئے اس کے ساتھ گئے تھے اور جہاد میں شریک ہوئے تھے ۔ مگر جب اس کی نیت خراب ہوئی اور کفار سے جہاد کے بجائے اس نے خلافت سے بغاوت اور ملت اسلامیہ کے ساتھ غداری کے جرم عظیم کا ارتکاب کیا تو یہ حضرات علماء اس سے الگ ہوگئے ۔ اس کے بعد بھی اگر وہ فوری طور پر واپس نہ آسکے تو یہ رکنا مجبوری تھا ۔ ظاہر ہے کہ ابن الاشعث نے قطعاً یہ پسند نہ کیا ہوگا کہ اتنی بڑی جماعت خصوصا علماء کی جماعت ، عین میدان جنگ میں اس کے لشکر سے الگ ہوجائے اور دارالاسلام پہنچ کر اس کی مخالفت کرے ۔ اس لئے اس نے انہیں ڈرا دھمکا کر لشکر میں ٹھہرنے پر مجبور کیا ہوگا ۔ موقع ملتے ہی یہ لوگ وہاں سے واپس آگئے اور اس فتنہ پرداز سبائی ذہن والے غدار باغی کے فتنہ کو فرو کرنے میں حکومت اسلامیہ کی اعانت کرنے لگے ۔ اگر ابن کثیر کے قول مذکور کا یہ مطلب نہ لیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ انہوں نے غلط بیانی کی اور سبائی مورخین و رواۃ کے کذب و بہتان کو نقل کرکے اپنے مورخانہ وقار کو مجروح کرلیا ۔

ہمارے نزدیک ابن کثیر کے قول کا مطلب وہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے ۔ مودودی صاحب نے اس سیاق میں نقل کرکے ناواقف قاری کو مغالطہ دینے کی افسوسناک کوشش کی ہے ۔ جہاد میں ان علماء کی شرکت سے انکار نہیں ، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ بغاوت و غدر میں بھی اس فتنہ پرداز کے شریک تھے ۔ انہیں مفسد و باغی ابن الاشعث کا شریک کار یا موید کہنا ان حضرات پر بہتان و افتراء اور سراسر کذب و دروغ ہے ۔ بلاشبہ ان حضرات نے اس وقت اس کا ساتھ دیا تھا ، جب وہ کفار کے مقابلے میں مصروف جہاد تھا مگر جب اس نے بغاوت اور غداری کی تو اس وقت یہ اس سے الگ ہوگئے ۔ ابن کثیرؒ کے قول مذکور یا اسی مضمون کے دوسرے اقوال و روایات سے اس مقصد پر استدلال کرنا بہت مذموم غلطی اور مکروہ قسم کی مغالطہ دہی ہے ۔

اس سے یہ بات بھی روشن ہوگئی کہ ابن الاشعث کی تائید میں شعبیؒ ، حسن بصریؒ ، ابن ابی لیلیٰؒ کی جو تقریریں مودودی صاحب نے نقل کی ہیں وہ بھی موضوع ، جعلی اور سبائی رواۃ و مورخین کی گڑھی ہوئی ہیں ۔ جب یہ لوگ اسے چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے اور غدر و بغاوت اور فتنہ میں اس کے شریک ہی نہیں رہے تو یہ تقریریں کب کیں ؟ اور کیوں کیں ؟ نیز یہ کہ پھر جب اپنے وطن واپس آئے تو ان تقریروں کی بناء پر حکومت اسلامیہ نے ان کی گرفت کیوں نہ کی ؟ اس سے عیاں ہے کہ یہ تقریریں جھوٹے سبائی راویوں کی تصنیف کی ہوئی ہیں اور ان بزرگوں کی طرف ان کی نسبت بالکل غلط اور خالص

جھوٹ ہے۔

تاہم سعید بن جبیر کی طرف منسوب کر کے جو تقریر نقل کی گئی ہے اس کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ واقعی ان کی تقریر تھی۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ ابن الاشعث کی تائید اور بغاوت و غدر پر لوگوں کو برانگیختہ کرنے کے جرم عظیم پر ان کی گرفت کی گئی اور حجاج نے انہیں سزائے موت دی۔ ممکن ہے کہ دو ایک اور غیر معروف علماء جو سعید بن جبیر کی طرح سبائی تشہیر و تزویر کا شکار ہوگئے ہوں ان کے ہم خیال ہوں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ابن الاشعث حق پر تھا اس کا باطل ہونا دلیل شرعی سے ثابت ہے۔ خلافت اسلامیہ سے بغاوت خود معصیت کبیرہ اور جرم عظیم ہے۔ اس کے ساتھ اس کا کفار سے مل جانا' ان کے ہاتھ سے مسلمانوں کو قتل کروانے اور مملکت اسلامیہ کو تباہ کرنے کی کوشش کرنا تو نہایت مکروہ اور شنیع غداری ہے جس کا گناہ عظیم اور معصیت کبیرہ ہونا بدیہی اور واضح ہے ایسے مفسد' باغی اور غدار کی تائید کرنا' اس کی غداری' بغاوت اور اس کے فساد فی الارض کو "جہاد" کہنا نہایت قبیح اور جرم عظیم ہے۔ اس تائید کا مطلب خود ان جرائم میں شرکت کرنا ہے۔ سعید بن جبیر اس کے مرتکب ہوئے۔ حجاج مرحوم نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنے گناہ عظیم سے باز آجائیں۔ انہیں نرمی کے ساتھ سمجھایا بجھایا' استمالت کے لئے ہدیئے تحفے دیئے لیکن سبائی زہر ان کے دماغ پر اس قدر قوی اثر کر چکا تھا کہ وہ کسی طرح اس سے باز نہ آئے۔ بغاوت اور غداری کی سزا شرعاً و عقلاً قتل ہے۔ وہ ایک باغی غدار' مفسد کی پر زور تائید کر رہے تھے۔ اسے تقویت پہنچانے کے ساتھ' خود دوسروں کو بغاوت و غداری اور فساد فی الارض کی ترغیب دے رہے تھے۔ اس طرح وہ خود ان عظیم و قبیح جرائم و معاصی کے مرتکب ہو رہے تھے۔ وہ شرعاً مستوجب قتل تھے۔ حجاج نے جو انہیں سزائے موت دی تو ان کا یہ فیصلہ شرعاً و عقلاً ہر طرح جائز تھا۔ اسے ظلم کہنا خود ظلم ہے۔ سعید بن جبیر بہت بڑے درجہ کے عالم دین تھے۔ مجتہد تھے' اپنی ذاتی و انفرادی زندگی میں بہت متقی اور عابد و زاہد تھے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اسلامی قانون سے بالاتر ہوگئے تھے۔ شریعت اسلامیہ' قانون سے کسی کے استثناء کی اجازت نہیں دیتی۔ قانون سب کے لئے ایک ہی ہے۔ کسی کو اس کی ذاتی زندگی کی پاکیزگی یا اس کے علم و فضل کی وجہ سے کسی جرم کی سزا سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم ان کی مغفرت کے لئے دعا تو کرتے ہیں مگر انہیں اس جرم سے بری نہیں کہہ سکتے۔ اور ان کی اس معصیت کبیرہ کو طاعت و سعادت نہیں کہہ سکتے۔

بکثرت لوگ اس مغالطہ عامتہالورود میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ کسی انسان کی انفرادی زندگی اور اس کی اجتماعی زندگی ' دونوں میں ہمیشہ یکسانیت ہوتی ہے ۔ جو شخص اپنی ذاتی اور انفرادی حیات میں متقی ' عابد و زاہد ہوتا ہے اس کے متعلق عام طور پر لوگ یہ حسن ظن قائم کرلیتے ہیں کہ سیاسی میدان میں بھی اس کا ہر قدم زہد و تقویٰ کا پابند ہوگا ۔ بکثرت ایسا ہوتا بھی ہے یعنی ایسے افراد بھی شاذ و نادر نہیں ہیں جن کی انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہوتا ۔ وہ جس طرح اپنی ذاتی زندگی میں متقی ہوتے ہیں اسی طرح اپنی اجتماعی زندگی مثلاً معاشرت ' سیاست وغیرہ میں بھی تقویٰ ان کا شعار ہوتا ہے ۔ اور وہ حسبتہ للہ اخلاص کے ساتھ دین و ملت کی خدمت و نصرت کرتے ہیں ۔ لیکن ہمیشہ ایسا ہونا ضروری نہیں ہے ۔ بکثرت مثالیں اس کے برعکس بھی ملتی ہیں ۔ تاریخ دیکھئے اور اپنے زمانہ کے حالات کا بغور مطالعہ کیجئے تو بہت بڑی تعداد ایسے اشخاص کی ملے گی جن کی انفرادی زندگی دینی اور اخلاقی نقطہ نظر سے بہت قابل تحسین و ستائش نظر آتی ہے مگر ان کا اجتماعی کردار قبیح و مذموم دکھائی دیتا ہے ۔ (۱)

سعید بن جبیر بھی اسی قسم کے شخص تھے ۔ بہت بڑے درجہ کے عالم دین تھے ۔ اور ان کی انفرادی زندگی زہد و تقویٰ کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی ۔ مگر ذہن نے سبائی زہر پی لیا۔ بعض افکار بگڑے تو اجتماعی کردار میں بھی فساد پیدا ہوا اور اس نے تقویٰ و احتیاط کے سب حدود پار کرلئے ۔ اسلامی حکومت و نظام حکومت کے خلاف اسلام ہی کا نام لے کر ایک باغی و غدار کی حمایت کرنے لگے یہی نہیں بلکہ اس کی بغاوت و غداری کی تحسین کرکے دوسرے لوگوں کو اس میں شرکت کی دعوت دینے لگے ۔ ان حالات میں حجاج مرحوم کی حکومت کے بجائے کوئی دوسری حکومت ہوتی تو وہ بھی وہی کرتی جو حجاج نے کیا ۔
ان کا یہ فیصلہ شرعاً ' عقلاً و عرفاً ہر طرح جائز تھا ۔ اس پر اعتراض کرنا اور اسے ظلم کہنا صحیح نہیں ۔

خلافت بنی امیہ کے مخالفین و معاندین ' اور ان کی عظمت پر حسد کرنے والوں میں جو

---

(۱) موجودہ دور (۱۴۱۰ھ مطابق ۱۹۹۰ء) میں بھی اس کا مشاہدہ ہورہا ہے ۔ ہماری سیاسی قیادت جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے ان میں بکثرت ایسے افراد بھی ہیں جن کی ذاتی اور انفرادی زندگی بہت متقیانہ اور قابل تحسین ہے ۔ لیکن یہی افراد جب کسی سیاسی پلیٹ فارم پر آتے ہیں ' یا کسی ادارے کے سربراہ یا عہدیدار مقرر ہوجاتے ہیں تو ان میں اور ایک فاسق و فاجر سیاسی لیڈر ' یا سربراہ میں کوئی فرق نہیں رہتا ۔

ذہین اور صاحب علم ہیں، وہ اپنی کمزوری سے واقف ہیں - وہ خوب جانتے ہیں کہ دلیل و برہان سے ہم اپنے غلط دعوے کو ثابت نہیں کرسکتے - اس لئے وہ تشہیر اور پروپیگنڈے کا طریقہ اختیار کرتے ہیں استدلال کے بجائے خطابت سے کام لینے کے لئے اس دور اور بعد کے دور کے متعدد علماء کے اقوال پیش کرنے لگتے ہیں کہ دیکھو فلاں فلاں بزرگ نے حجاج کو ظالم و جابر کہا ہے، جیسے مودودی صاحب نے حضرت حسن بصری وغیرہ کے دو تین اقوال پیش کئے ہیں - چند صفحات پہلے میں ان کا تذکرہ کرکے ان کا جواب دے چکا ہوں - سعید بن جبیر کے قتل کے بارے میں مخالفین خلافت نے یہی روش اختیار کی ہے - یہ لوگ اس حادثے کے متعلق بہت سے علماء مشائخ کے منثور مرثیوں کا انبار لگا دیتے ہیں - یہی نہیں بلکہ سعید بن جبیر کے قتل کی کیفیت و حالت کے متعلق جو افسانے، سبائیوں اور سبائیت نوازوں نے گڑھے ہیں انہیں بھی بانداز مرثیہ خوانی بیان کرتے ہیں - ان غلط اور سبائیوں کی گھڑی ہوئی کہانیوں کی اس قدر تشہیر کی گئی کہ قدیم طرز کے مدارس عربیہ کے طلبہ میں ان کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے - حالانکہ ان مدارس میں تاریخ کا مضمون داخل نصاب نہیں ہے - عہد عبد الملک کے بارے میں جو مضمون لکھا جاتا ہے تو اس میں حجاج کا تذکرہ اور اس قتل کے واقعہ کا ذکر کرنا اور اس کے ساتھ یہ لکھنا کہ "سعید بن جبیر نے قبلہ کی طرف رخ کیا تو حجاج نے ان کا رخ ادھر سے پھروا دیا" ضروری سمجھا جاتا ہے - حالانکہ یہ محض افسانہ ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں - شیعہ مورخین اور شیعہ راویوں نے یہ جھوٹے قصے گڑھے ہیں جو بالکل بے اصل ہیں -

اس مغالطہ انگیز استدلال کا اطمینان بخش رد و جواب یہ ہے کہ اس واقعہ کا کسی مورخ یا عالم دین نے انکار نہیں کیا کہ سعید بن جبیر ابن الاشعث کی تائید کررہے تھے - اور صرف تائید نہیں بلکہ لوگوں کو اس کی بغاوت و غداری میں شریک ہونے کی ترغیب دے رہے تھے - باوجود افہام و تفہیم اور استمالت وہ اس سے باز نہیں آئے - یہی ان کا جرم تھا جب جرم ثابت ہوگیا تو شرعاً و عقلاً ہر طرح ان کا قتل جائز قرار پایا - اس کے بعد مورخین اور علماء کا محض اپنے جذبات کی بناء پر اسے مذموم کہنا قطعاً قابل اعتبار نہیں اور ان کے جذباتی اقوال کو پرکاہ کے برابر بھی وزن نہیں دیا جاسکتا - جب دلیل شرعی سے ایک چیز کی صحت ثابت ہوگئی تو مورخین و علماء کی ذاتی، و جذباتی رائے اور ان کی نوحہ خوانی کی بناء پر عدل کو ظلم اور صحیح کو غلط نہیں کہا جاسکتا -

اموی دور یا عباسی دور کے بعض علماء نے جو اس واقعہ پر مرثیہ خوانی کی ہے - اور

اسے حجاج کا ظلم قرار دیا ہے ۔ اس کے متعدد اسباب ہیں ۔ مناسب ہے کہ یہاں ان کی طرف اشارہ کردیا جائے ۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ صرف سعید بن جبیر کے قتل کے معاملے میں نہیں بلکہ اسلامی تاریخ کے بہت سے مسائل کے بارے میں قاری سبائی مغالطوں سے محفوظ رہ سکیں گے ۔

ایک عام قانون نفسی اس کا پہلا سبب ہے ۔ وہ یہ ہے کہ بعض خصوصیات میں اشتراک کی وجہ سے جب بہت سے افراد کا ایک گروہ بن جاتا ہے تو ان میں ایک گروہی عصبیت پیدا ہوجاتی ہے ۔ اور کبھی یہ اس قدر بڑھتی ہے کہ انسان اپنے زمرے کے آدمی کی حمایت میں جا و بے جا کی بھی کوئی پرواہ نہیں کرتا ۔ پھر یہ کہ سعید بن جبیر کے شاگرد بھی بکثرت تھے ' ان صورتوں کی وجہ سے جب وہ قتل کئے گئے تو علماء کے دل کو انہیں خطا وار جاننے کے باوجود صدمہ پہنچا اور اس لئے انہوں نے حجاج کی مذمت شروع کردی اور عدل کو ظلم کہنے لگے ۔

بغیر کسی تحقیق کے حجاج کو ظالم اور اموی خلفاء کو ستم گر کہنا اسلامی تاریخ پر ظلم ہے !

عباسی دور کے بعض علماء و مورخین نے شیعوں اور حکومت کو خوش کرنے کے لئے بنو امیّہ پر طعن و تشنیع کرنا مناسب اور نفع بخش خیال کرکے موقع بے موقع ان پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ کی ۔ اس سلسلہ میں حجاج کے خلاف زہر افشانی ناگزیر تھی ۔ عباسی دور میں شیعوں کا زور اتنا بڑھ گیا تھا کہ ارباب حکومت کا قرب حاصل کرنے کے لئے شیعوں کو خوش رکھنا مفید بلکہ ایک حد تک ناگزیر معلوم ہوتا تھا ۔ براہ راست حکومت کو خوش کرنے کے لئے بھی یہ ذریعہ مناسب معلوم ہوتا تھا ۔ ہندوستان کے علماء نے عہد عباسی کے انہیں علماء کی تقلید کی اور بغیر کسی تحقیق کے حجاج کو ظالم و جابر اور اموی خلفاء کو ستم گر کہتے رہے ۔ اور بعض نے ان مطاعن کی حقیقت سے واقفیت کے باوجود شیعوں کی خوشنودی کے لئے ان کی خصلت تبرا بازی ' اختیار کرلی اور اموی خلفاء و عمال و حکام کو برا کہنا اپنا شعار بنالیا ۔ ان علماء و مورخین اہلسنت کے اس طرز عمل کی نوعیت کا علم ہونے کے بعد حجاج یا خلفاء بنی امیہ کے بارے میں ان کی مذمت کا اعتبار کرنا اور اسے اسلامی تاریخ کو تاریک ثابت کرنے کے لئے دلیل بنانا عقل و دانش سے بے رخی ' عدل و انصاف سے بے مہری اور اسلامی تاریخ پر ظلم ہے ۔

علماء کے ایک طبقہ کی اس غلط روی کے نظائر بکثرت ہیں ۔ ایک واقعہ جو چند سال پہلے

پاکستان ہی کی سرزمین پر پیش آیا پیش کرتا ہوں ۔ میں اس وقت تک پاکستان نہیں آیا تھا ۔ بلکہ ہندوستان ہی میں مقیم تھا ۔ اخبارات سے اس واقعہ کا علم ہوا ۔ اور جب ۱۹۷۰ء میں پاکستان آیا تو اس کی مزید تصدیق ہوئی ۔ صحیح سنہ تو یاد نہیں لیکن اندازا ۲۰ ' ۲۵ سال گزرے ہوں گے عراق میں تین چار شیعہ علماء کو غداری اور حکومت بنی اسرائیل سے عراق کے خلاف ساز باز کرنے کے الزام میں پھانسی دی گئی ۔ ان سب پر باقاعدہ عدالت میں مقدمہ چلایا گیا ۔ اور انہیں اپنے دفاع کا پورا موقع دیا گیا ۔ الزام ثابت ہوگیا تو انہیں قانون کے مطابق سزائے موت دی گئی ۔ مگر حکومت عراق کے سربراہ سنی تھے ۔ اس لئے پاکستان کے شیعہ علماء میں صف ماتم بچھ گئی اور انہوں نے حکومت عراق کے خلاف احتجاج شروع کیا ۔ اس احتجاج کا ایک مکروہ پہلو یہ تھا کہ اس میں بعض علماء اہل سنت بھی با جبہ و دستار شریک تھے اور عراق کی سنی حکومت کے خلاف زہر افشانی میں وہ بھی شیعوں سے پیچھے نہیں رہے ۔

اس واقعہ پر نظر کرنے کے بعد آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ عہد عباسی میں علماء کی ایک تعداد کا شیعہ نواز ہونا قطعاً قابل تعجب اور بعید از قیاس نہیں ۔ ایسے علماء کے لئے ہم دعائے مغفرت تو کرسکتے ہیں ۔ ان کے نام کے ساتھ رحمہ اللہ اور غفرلہ ' بھی لکھ سکتے ہیں لیکن ان کے غلط اقوال و بیانات کو صحیح نہیں کہہ سکتے ۔ اور ان کے ان اقوال فاسدہ کا اعتبار کرکے اپنی شاندار اور درخشاں تاریخ کو داغ دار نہیں بنا سکتے ۔

جس طرح ابن الاشعث کی بغاوت اور غداری ایک فتنہ تھی ۔ اسی طرح صفحات تاریخ میں اس کی حکایت بھی کسی حد تک ایک فتنہ ثابت ہوئی ہے ۔ یوں تو مؤرخین کا بیان واضح ہے ۔ خصوصا علامہ ذہبی نے تو بات بالکل صاف کردی ہے ۔ اور یہ حقیقت خوب عیاں کردی ہے کہ ابن الاشعث مذکور باغی اور غدار واجب القتل تھا ۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی ان کے بیان سے بالکل عیاں اور الم نشرح ہوگئی کہ علماء و صلحاء اہل سنت قطعاً اس کی بغاوت و غداری میں شریک نہیں ہوئے ۔ ایک دو علماء جن کا ذہن سبائی زہر سے متاثر و مسموم ہوگیا تھا ۔ اس کے موید ہوگئے تھے مگر ایک دو عالموں کی تائید و شرکت کو علماء کی شرکت نہیں کہہ سکتے ۔ ان کی کتاب تاریخ الاسلام سے چند صفحات پہلے یہ سب باتیں نقل کی جاچکی ہیں ' مگر جس عبارت کا ہم نے حوالہ دیا ہے اس کے آخر میں ایک جملہ ایسا بھی ہے جس سے مخالفین خلافت بنی امیہ ناواقفوں کو مغالطہ دینے کا کام لے سکتے ہیں ' اس لئے مناسب ہے کہ اس کی وضاحت بھی کردی جائے ۔

علامہ ذہبی عبدالرحمن ابن **الاشعث** کی غداری اور پھر اس کا عسکر خلافت سے شکست کھاکر "بست" کی طرف فرار، اس کے لشکر کا منتشر ہوجانا اور اس کا ساتھ چھوڑ دینا، عامل بست کا (جسے خود ابن **الاشعث** ہی نے مقرر کیا تھا) اسے گرفتار کرلینا۔ ان سب امور کا تذکرہ کرکے لکھتے ہیں کہ اس موقع پر **رتبیل**، اپنا لشکر لے کر آیا اور عامل بست کو جنگ و قتل کی دھمکی دے کر ابن **الاشعث** کو رہائی دلائی اور اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنے ہمراہ لے گیا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں۔

" و كان مع ابن الاشعث عدد كثير من الاشراف و الكبار ممن لم يثق بامان الحجاج " (۱)

" اور ابن **اشعث** کے ساتھ بہت سے معززین اور بڑے لوگ تھے، جنھیں حجاج کے وعدہ امان کا اعتبار نہیں ہوا " (مطلب یہ ہے کہ وہ بھی ابن **الاشعث** کے ساتھ **رتبیل** کے یہاں چلے گئے)

اس عبارت سے بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ شاید علماء کی ایک کثیر تعداد ابن **الاشعث** کی ہمنوا ہوگئی تھی۔ لیکن یہ شبہ بوجوہ ذیل بالکل غلط ہے :-

(۱) اس میں "اشراف"، "وکبار" کے الفاظ ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو سوسائٹی میں امتیاز رکھتے تھے، اور انہیں عوام سے نسبتاً اونچا درجہ دیا جاتا تھا۔ ان لوگوں کا عالم دین ہونا ضروری نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ بڑے تاجر، یا کسی بڑی جائیداد کے مالک ہوں، یا کسی جگہ کے سیاسی یا معاشرتی لیڈر ہوں۔ "شریف" و "کبیر" ہونے کے لئے کسی زمانہ میں بھی عالم دین ہونا ضروری نہیں تھا۔ اس سے ان کا زمرہ علماء میں سے ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے برعکس یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ علماء میں سے نہیں تھے۔ اگر علماء ہوتے تو مورخ ضرور ان کا تذکرہ "علماء" کے لقب کے ساتھ کرتا۔

(۲) "**ممن لم يثق بامان الحجاج**" کے الفاظ سے عیاں ہے کہ حجاج نے انہیں امان دے کر واپسی کی اجازت دیدی تھی۔ مگر امان کا مطلب تو یہی ہے کہ ان لوگوں نے ابن **الاشعث** کی بغاوت و غداری سے اپنی برات و بے تعلقی ظاہر کی تھی۔ حجاج نے ان کی بات کا یقین کیا اور انہیں امان دے دی۔ اس سے روشن ہے کہ یہ لوگ بھی ابن **الاشعث** کے ساتھ اس وقت تک رہے جب تک وہ کفار کے مقابلہ میں جنگ کرتا رہا۔ جب اس نے غدر کیا اور باغی ہوکر کافروں سے مل گیا تو ان "اشراف"، "وکبار" نے اس کا ساتھ

---

(۱) بحوالہ سابق۔

چھوڑدیا۔ اس لئے علامہ ذہبی کی اس عبارت سے

ابن الاشعث کی بغاوت و غداری میں علماء و صلحاء کی شرکت ثابت کرنے کی کوشش کرنا افسوسناک مغالطہ دہی اور فریب کاری ہے۔

حجاج کی عظیم القدر خدمات

حجاج مرحوم نے قرآن مجید کی جو عظیم القدر خدمت انجام دی اس کا اعتراف کرنے پر ان کے دشمن بھی مجبور ہیں۔ مودودی صاحب نے بھی بادل ناخواستہ لکھ دیا:۔

"قرآن پر اعراب لگوانا اس کی وہ نیکی ہے، جس کی تعریف رہتی دنیا تک کی جائے گی۔" (ص ۱۸۵)

حجاج کی یہی نیکی جسے اس کے دشمن بھی بادل ناخواستہ تسلیم کرتے ہیں، ان کے ساتھ سبائیوں کی شدید عداوت کا سبب بن گئی۔ قرآن مجید سینوں اور سفینوں میں محفوظ ہوچکا تھا۔ اور اس دور تک تواتر کے ساتھ پہنچا تھا۔ لاکھوں کی تعداد میں حفاظ، اور سینکڑوں کی تعداد میں قرآن مجید کے نسخے موجود تھے۔ ان سب کی تعداد روز افزوں تھی۔ لیکن اس مکتوب قرآن مجید پر اعراب یعنی زیر زبر پیش نہیں لگے ہوئے تھے۔ قرآن مجید میں کسی تحریف کا تو امکان باقی نہیں رہا تھا لیکن اس کا اندیشہ تھا کہ کہیں شیعہ اور یہود عجمی نو مسلموں کو فریب دے کر اعراب کی غلطیوں میں نہ مبتلا کردیں نیز اس سے جو اختلاف پیدا ہو اس کی اشاعت کرکے قرآن مجید کے محفوظ ہونے کے بارے میں دین سے ناواقف نو مسلموں کے دلوں میں شکوک و شبہات نہ پیدا کردیں۔ اس خطرے کا احساس حجاج مرحوم نے کرلیا اور قرآن پر اعراب لگواکر اس کی حفاظت کے لئے ایک اور مضبوط حصار کا اضافہ کردیا۔ جس کی وجہ سے قرآن مجید میں اختلاف کا شبہ پیدا کرنے کا کوئی امکان ہی نہیں باقی رہا۔ حجاج ؒ مرحوم کے اس اقدام سے شیعوں اور یہود کے ارمانوں پر اوس پڑگئی۔ یہ دشمنانِ قرآن تو اسی فکر اور کوشش میں لگے رہتے تھے کہ موقع نظر آئے تو قرآن مجید میں تحریف نہیں تو شبہ تحریف پیدا کرکے سب مسلمانوں کو نہ سہی، کم از کم نو مسلموں کے ایک گروہ کو تو گمراہ کردیں۔ حجاج ؒ نے ان سب کو مایوس کردیا۔ اس مایوسی نے ان کے دل میں اس کے خلاف عداوت کا شعلہ بھڑکادیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان دشمنان قرآن امت سبائیہ کاذبہ نے مرحوم کے خلاف پیٹ بھر کر جھوٹ بولا ہے، اور پیالہ بھر کر زہر اگلا ہے۔ شیعہ اور ان کے معاون خوب سمجھ گئے کہ قرآن مجید میں تحریف غیر ممکن ہے۔ لیکن انہوں نے

سوچا کہ پورے قرآن مجید کو نہ سہی اس کے کسی چھوٹے سے جز ہی کو مشکوک بنادیں۔ اس کے لئے انہوں نے یہ تدبیر کی کہ بعض صحابہ کرامؓ کی طرف اختلاف قرات کے نام سے بعض قرائتیں منسوب کردیں جو قرأت متواترہ سے بالکل مختلف تھیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف جو قرأت، متواترہ قرات کے خلاف منسوب ہے وہ بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ شیعوں کے اس کید و فریب کو مٹانے کے لئے اور اہل ایمان کو بچانے کے لئے انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی مبینہ قرأت کا پڑھنا اور لکھنا قانوناً ممنوع قرار دیا۔ ان کا یہ اقدام ہر طرح مستحسن اور لائق تعریف و ستائش ہے مگر سبائی ذہن اس واقعہ کو ان کا عیب کہتا ہے۔ چنانچہ مودودی صاحب لکھتے ہیں:۔

"حضرت عبداللہؓ بن مسعود کو وہ سردار منافقین کہتا تھا۔ اس کا قول تھا کہ اگر ابن مسعود مجھے مل جاتے تو میں ان کے خون سے زمین کی پیاس بجھاتا۔" اس نے اعلان کیا کہ ابن مسعود کی قرات پر کوئی شخص قرآن پڑھے گا تو اس کی گردن ماردوں گا۔ اور مصحف میں سے اس کی قرأت کو اگر سور کی ہڈی سے بھی چھیلنا پڑے تو چھیل دوں گا۔" (ص ۱۸۶)

"سور کی ہڈی سے چھیلنا" اور حضرت عبداللہ بن مسعود کی شان میں بے ادبی کرنا، روافض کا افتراء اور بہتان ہے۔ ان لوگوں نے حضرت عثمانؓ پر بھی یہ بہتان باندھا ہے کہ "انہوں نے حضرت عبداللہؓ بن مسعود کو پٹوایا جس سے انہیں "ہرنیا" (آنت اترنا) کا مرض ہوگیا۔"

یہ سب سبائی کارخانہ دروغ بافی کی ساختہ روایتیں ہیں۔ صحیح بات صرف اتنی ہے کہ اس نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی مبینہ قرأت پڑھنے اور اشاعت و تعلیم کی سختی کے ساتھ ممانعت کردی تھی۔ ان کا یہ فعل حد درجہ قابل تحسین ہے۔ اس کا مقصد قرآن مجید کی حفاظت تھا۔ سبائی ذہن رکھنے والوں کا اس پر اعتراض کرنا، اس کی دلیل ہے کہ عداوت بنی امیہ کی شدت نے ان کی عقل و فہم کو ماؤف کردیا ہے کہ خوبی کو برائی کہہ رہے ہیں۔ حق یہ ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی طرف قرأت متواترہ کے خلاف جو قرأت منسوب

کی جاتی ہے وہ ان پر بہتان و افتراء ہے - اسی طرح بعض دوسرے صحابہؓ مثلاً حضرت ابن عمرؓ یا حضرت ابن عباسؓ وغیرہ کی طرف اسی قسم کی جو قرأتیں منسوب کی جاتی ہیں وہ قطعاً ان بزرگوں پر بہتان و افتراء ہیں - یہ حضرات اس سے بری ہیں - اس قسم کی سب روایتیں قطعاً باطل کذب و دروغ' اور شیعہ مفسدوں کی وضع کردہ ہیں - قرآن مجید تواتر سے ثابت ہے - اور اس کا ثبوت قطعی و یقینی ہے - خبر واحد سے کسی لفظ کا جزو قرآن ہونا قطعاً ثابت نہیں ہوسکتا - اسے قرآن یا اس کا جزو سمجھنا گمراہی اور ضلال ہے - کوئی عقل سلیم اس امر کو باور نہیں کرسکتی کہ یہ صحابہ کرامؓ جنہوں نے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی - ساری عمر کسی آیت کی تلاوت میں غلطی کرتے رہے؟ اور ان الفاظ کو الفاظ قرآن سمجھتے رہے جو درحقیقت قرآن نہیں ہیں' جس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اس موقع کے ان الفاظ سے مختلف ہیں جو ہزاروں صحابہؓ پڑھتے تھے -

یہ بھی یاد رہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک کتاب مسمی بقرآن مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں دے دی تھی' کہ وہ جیسے چاہیں اسے پڑھتے رہیں - بلکہ آنحضور علیہ افضل الصلوات والسلام نے قرآن مجید کی باقاعدہ تعلیم دی تھی - پھر کیا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو کچھ اور کسی کو کچھ پڑھایا تھا - جس قرآن کی تعلیم عام آپؐ نے دی تھی جو ہزاروں نے آپ سے حاصل کی تھی اور جو تواتر کے ساتھ منقول ہے - کیا حضرت ابن مسعودؓ (یا دو تین مزید صحابہؓ کو جن کی طرف اس قسم کی قرأتیں منسوب کی جاتی ہیں) کو اس کے خلاف تعلیم دی تھی؟ کوئی عقل سلیم اسے باور نہیں کرسکتی کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کتاب میں یہ تفریق فرمائی ہو -

اسی طرح عقل اسے بھی باور نہیں کرسکتی کہ یہ حضرات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم حاصل کرنے کے باوجود عمر بھر غلطی میں مبتلا رہے - حالانکہ ان کے ہزاروں ساتھی قرآن مجید پڑھتے اور سنتے رہتے تھے مگر انہوں نے ان کی قرات سن کر بھی اپنی غلطی کی اصلاح نہ کی - اور ان میں سے بھی کسی نے انہیں ان کی غلطی پر نہیں ٹوکا - حاصل بحث یہ کہ یہ اختلاف قرأت کی روایتیں جو اخبار آحاد ہیں اور ان میں بھی ضعاف بلکہ درحقیقت موضوع' جعلی' دشمنان قرآن کی وضع کی ہوئی ہیں ان سے قرآن کریم کی جو قرأتیں معلوم ہوتی ہیں' ان کا لکھنا اور پڑھنا' اور انہیں قرآن مجید کی قرات سمجھنا' نیز ان نام نہاد قرأتوں کو ان صحابہ کرامؓ کی طرف منسوب کرنا قطعاً حرام اور ممنوع ہے - اگر ایسی قرأتوں کو لکھنے اور پڑھنے سے حجاج مرحوم نے منع کردیا تھا تو کیا برا کیا - اس پر

اعتراض کرنا اس بات کی واضح علامت ہے کہ معترض کے دل میں قرآن مجید کی وہ عظمت اور وقعت نہیں ہے جو ایک مومن کے دل میں ہونا چاہئے۔ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حجاج مرحوم حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ بہت عقیدت رکھتے تھے۔ امیر المومنین عبدالملک نے بھی انہیں حضرت موصوف کی اطاعت کا حکم دیا تھا۔ حجاج مرحوم ہمیشہ اس پر عامل رہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ انہوں نے آں محترم کو قتل کی دھمکی دی، کسی طرح قابل یقین نہیں۔ اسی طرح حضرت انس، اور سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہما کو گالیاں دینے، ان کی گردن پر مہریں لگوانے کی کہانی اور اسی قسم کے دوسرے قصے شیعوں اور شیعہ نوازوں کے گڑھے ہوئے قصے ہیں۔ اور سبائی کارخانہ دروغ بانی کے تیار کئے ہوئے جھوٹے افسانے ہیں۔ یہ تاریخی خبریں نہیں ہیں بلکہ سبائی پروپیگنڈہ اور تشہیر ہے۔ جو شیعہ مورخین طبری، ابن اسحاق وغیرہ نے بہت شوق سے اپنی کتابوں میں اکٹھا کرلیا۔ پھر کچھ جھوٹ اور دروغ اپنی طرف سے اس میں ملا کر پروپیگنڈے کا ذہنی زہر تیار کیا۔ اس قسم کی سب روایات میں کوئی نہ کوئی شیعہ راوی ضرور ملے گا۔ کبھی بغیر تقیہ اور کبھی نقاب تقیہ ڈالے ہوئے۔ اکثر و بیشتر تو یہ روایتیں مشہور کذاب و مفتری، ابو مخنف کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ سنی مؤرخین مثل ابن کثیر و ابن اثیر تاریخ لکھنے بیٹھے تو انہوں نے "نقل راچہ عقل" پر عمل کیا۔

ان کے متعلق میں جلد اول میں عرض کرچکا ہوں کہ تاریخ کے ذوق اور اس کے سلیقے سے محروم تھے۔ انہیں صرف روایتوں کا انبار لگانا آتا تھا۔ کثرت روایات کی ہوس بھی بہت تھی۔ کیونکہ ان کے دور میں محدث اور مورخ کے کمال کا معیار یہی بن گیا تھا کہ اس کے پاس روایات کا ذخیرہ زیادہ ہو اس کے ساتھ ان کا ذہن بھی صاف نہ تھا۔ یہ سنی تھے مگر ان کا ذہن و دماغ پورے طور پر سنی نہیں تھا۔ شیعی پروپیگنڈے کے اثرات ان کی تاریخوں بلکہ ان کی دوسری کتابوں میں بھی نمایاں ہیں۔ بنو امیہ اور بنو عباس دونوں کے خلاف اس قسم کی غلط روایتیں مشہور کرکے، اور معاندانہ جھوٹا پروپیگنڈہ کرکے شیعوں نے عوام اہل سنت کو بھی ان سب کے خلاف سخت بدگمان کردیا تھا۔ عوام کے گمان و اعتقاد کے خلاف زبان کشائی بڑی ہمت کا کام ہے۔ ایسے علماء تو بہت سے ملتے ہیں۔ جنہوں نے حکومت کے خلاف جرأت کے ساتھ بات کہی ہو۔ لیکن ایسے علماء کی تعداد اقل قلیل ہے جنہوں نے عوام کے رجحانات کے خلاف زبان کھولی ہو۔ ہم نے اچھے اچھے علماء کبار کو دیکھا کہ "خوف فتنہ" کی آڑ لے کر عوام کی ہاں میں ہاں ملانے لگتے ہیں۔ شیعوں نے پیہم

پروپیگنڈے سے عوام کے ذہن کو مسموم کردیا تھا - اس لئے وہ علماء و مورخین جنہوں نے بنو امیہ و بنو عباس کی خلافتوں پر اعتراضات کئے ہیں - اور شیعوں کی طرح ان پر "تبرا" بھیجا ہے' ان میں بہت سے ایسے تھے جنہوں نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا ہے' تاکہ عوام ان کے مخالف نہ ہوجائیں - ان علماء کے آراء اور اس موضوع پر ان کی روایتوں کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا - ہم انہیں درایت کی کسوٹی پر پرکھ کر ہی قبول یا رد کرسکتے ہیں - ان کے لئے قرائن کی شہادت لازم ہے - تاریخ اسلام کی خوبی یہ ہے کہ زیر بحث قسم کی جتنی روایتیں اور کہانیاں تاریخ میں ملتی ہیں - ان میں سے ایک بھی درایت کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی - اور قرائن کی شہادت ہمیشہ اس کے خلاف ہوتی ہے - جس سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ یہ کہانی کسی شیعی کارخانہ دروغ بافی کی مصنوعہ اور کسی شیعہ یا شیعہ نواز کی گڑھی ہوئی ہے - اور اس سے کذب آفرینی' افتراء پردازی' بہتان طرازی کا سبائی آرٹ خوب نمایاں ہوجاتا ہے - اس کے متعدد نمونے ہم صفحات سابقہ میں پیش کرچکے ہیں - فاضل قارئ ان مثالوں اور نمونوں کو دیکھنے اور سمجھنے کے بعد سبائیوں اور شیعیت نوازوں کے باقی اعتراضات کی غلطی اور لغویت بھی انہیں مثالوں پر قیاس کرکے معلوم کرسکتے ہیں -

خادم قرآن کریم' حجاج بن یوسف مرحوم و مغفور کے دو احسانات پوری امت پر ایسے ہیں جن کے بار سے سبکدوش ہونا اس کے لئے ممکن نہیں - ان میں ایک قرآن کریم پر اعراب لگوا کر اس کی حفاظت' اور اس کی اشاعت کرنا ہے - دوسرا سرزمین ہند تک اسلام پہنچانا ہے - یہ ان کے ایسے احسانات عظیمہ ہیں کہ جن کا اعتراف کرنے پر ان کے مخالفین بھی مجبور ہیں - چنانچہ مودودی صاحب نے بھی اپنی زیر نظر کتاب کے ص ۱۸۵ پر بادل نا خواستہ اس کا اعتراف کیا ہے - لیکن ان کی یہی خوبی دشمنانِ قرآن اور دشمنانِ اسلام کے نزدیک بہت بڑا عیب تھا - اس لئے وہ حجاج مرحوم کے سخت دشمن ہوگئے اور انہیں غلط اور لغو اعتراضات کا نشانہ بنایا -

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا معاملہ

ایک اعتراض جس کی ابتداء تو سنی نما شیعوں ہی کی طرف سے ہوئی - شیعوں نے اپنے مطلب کے لئے اسے اچھالا' اور بہت سے سنی بھی اس سے متاثر ہوگئے' ان کا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پر حملہ کرنا ہے - شرعی نقطہ نظر سے یہ اعتراض غلط ہے - حجاج مرحوم امیر المومنین عبدالملک کی طرف سے گورنر تھے - اور انہیں خلیفتہ المسلمین تسلیم کرتے تھے - اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو باغی جانتے تھے -

قرآن مجید میں صاف صاف باغی سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ واقع کے اعتبار سے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ باغی تھے یا نہیں؟ یہ مسئلہ الگ ہے۔ لیکن حجاج انہیں باغی ہی سمجھتے تھے۔ اور انہیں باغی ہی سمجھ کر ان سے جنگ کی۔ اس لئے شرعاً ان کے اوپر کوئی الزام نہیں ہے۔ اس اعتراض کے ساتھ جو حاشیہ آرائی کی گئی ہے۔ مثلاً سیدنا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی لاش کی تدفین سے مانع ہونا۔ اور اس کا بے گور و کفن کئی دن پڑا رہنا، یا سیدتنا حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی شان میں بد زبانی یا خانہ کعبہ پر پتھر برسانا وغیرہ۔ یہ شیعوں اور شیعیت نواز مخالف بنی امیہ سنی مورخین اور راویوں کے گڑھے ہوئے طبع زاد جھوٹے افسانے ہیں، جن کا کوئی قابل اطمینان ثبوت نہیں۔ بلکہ درایت اور قرائن ان کی تردید کرتے ہیں۔

مودودی صاحب نے اگر زیر بحث مسئلہ پر علامہ شبلیؒ نعمانی کی کتاب "الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی" کا مطالعہ کرلیا ہوتا تو شاید وہ شیعوں اور یہود و مستشرقین کے ان اعتراضات کا تذکرہ کرنے کی جسارت نہ کرتے۔ اگر انہوں نے کتاب مذکور دیکھی ہے تو ان کا ان غلط الزاموں کو دہرانا بہت ہی تعجب خیز اور افسوسناک ہے۔ یہ الزام غلط ہیں اور ان کا کوئی اطمینان بخش ثبوت قیامت تک نہیں پیش کیا جاسکتا۔ آئندہ سطور میں ان پر تفصیلی بحث اور ان اعتراضات کا اطمینان بخش جواب ملاحظہ ہو۔

(۱) مودودی صاحب حجاج کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اس ظالم نے عین حج کے زمانہ میں مکہ معظمہ پر چڑھائی کی جبکہ زمانہ جاہلیت میں کفار و مشرکین بھی جنگ سے ہاتھ روک لیتے تھے۔" (ص ۱۸۵)

○ تبصرہ:۔ مودودی صاحب نے یہ جملے لکھ کر قاری کو مغالطہ دینے کی مذموم کوشش کی ہے۔ کتب تاریخ متفق ہیں کہ حج کے زمانہ میں حجاج کی طرف سے کوئی جنگ نہیں کی گئی۔ یکم ذی الحجہ سے محاصرہ کرلیا گیا تھا۔ جنگ نہیں کی گئی پورے اشہر حرم میں کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ جنگ محاصرہ شروع ہونے سے پانچ ماہ بعد جمادی الاولیٰ میں ہوئی۔ بلکہ بنظر غائر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ کوئی جنگ ہوئی ہی نہیں۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:۔

"قال الواقدی حدثنی مصعب بن ثابت عن نافع مولی اسد وکان عالما بفتنۃ ابن الزبیر قال: حصر ابن الزبیر لیلۃ ھلال الحجۃ سنۃ ثنتین و سبعین، فکان حصر الحجاج لہ خمسۃ اشھر و سبع عشرۃ لیلۃ" (۱)

---

(۱) البدایہ و النہایہ ج ۸ ص ۳۲۹)

" واقدی کا بیان ہے کہ مجھ سے مصعب بن ثابت نے بروایت نافع مولیٰ اسد (وہ ابن الزبیرؓ سے خوب واقف تھے) بیان کیا کہ (حضرت) ابن الزبیرؓ کا محاصرہ ذی الحجہ ۷۲ ھ کی چاند رات سے شروع ہوا' اس کا مطلب یہ ہے کہ حجاج نے یہ محاصرہ پانچ ماہ اور سترہ راتوں تک جاری رکھا۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حج کے زمانہ میں محاصرہ جاری رہا۔ کوئی جنگ نہیں ہوئی ۔ جنگ کرنے کا الزام معترض نے اپنی طرف سے تراشا ہے جو بالکل غلط ہے۔ حافظ صاحب اس عبارت میں پانچ ماہ کے " محاصرے " کا تذکرہ کرتے ہیں جنگ کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے۔

حضرت حسن بصری کے حوالے سے موصوف لکھتے ہیں :-

" تیسرا واقعہ وہی ہے جس کا حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ نے آخر میں ذکر کیا ہے۔ مدینہ سے فارغ ہونے کے بعد وہی فوج جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں یہ اودھم مچایا تھا حضرت زبیرؓ سے لڑنے کے لئے مکہ پر حملہ آور ہوئی۔ اور اس نے منجنیق لگا کر خانہ کعبہ پر سنگ باری کی جس سے کعبہ کی ایک دیوار شکستہ ہوگئی۔ اگرچہ روایات یہ بھی ہیں کہ انہوں نے کعبہ پر آگ بھی برسائی تھی۔ لیکن آگ لگنے کے کچھ دوسرے وجوہ بھی بیان کئے جاتے ہیں۔ البتہ سنگ باری کا واقعہ متفق علیہ ہے۔"

○ تبصرہ :- حضرت حسن بصری" کی طرف اس سراپا کذب و دروغ بیان کی نسبت بالکل غلط ہے یہ جس طرح حجاج مرحوم اور ان کے لشکر پر بہتان و افتراء ہے۔ اسی طرح حضرت حسن بصری رحمہ اللہ پر بھی بہتان و افتراء ہے۔ شیعہ اور شیعہ نواز کذاب راویوں نے یہ جھوٹ گڑھا۔ واقعیت سے اسے ادنیٰ تعلق بھی نہیں۔ غلاف کعبہ شریف میں آگ لگنے کے متعلق مقبول اور معروف روایت یہ ہے کہ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے ساتھ والوں میں سے کسی نے موصوف کی اجازت سے کسی ضرورت سے حرم شریف میں آگ جلائی تھی اس کی کوئی چنگاری اڑ کر غلاف کعبہ پر پڑگئی جس سے اس میں آگ لگ گئی جو فوراً بجھادی گئی۔ اس میں حجاج یا ان کے لشکر کا کیا قصور تھا ؟ یہ ایک اتفاقی واقعہ تھا جسکی ذمہ داری کسی شخص پر بھی نہیں ڈالی جاسکتی۔ شیعہ راویوں اور مورخوں نے اس معمولی سی خبر کو

اپنے قلب کی سیاہی میں رنگ کر پیش کیا یہ گفتگو بھی اس صورت میں ہے جب آگ لگنے کا واقعہ بھی ثابت ہو ۔ حق یہ ہے کہ اگر اصول روایت و درایت کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو نفس آگ لگنا ہی ثابت نہیں اور آگ لگنے کا قصہ ہی سرے سے سبائیوں کا تصنیف کیا ہوا جھوٹا افسانہ معلوم ہوتا ہے ۔ "کعبہ پر آگ برسانے" کا الزام تو سراسر بہتان و افتراء اور بے بنیاد جھوٹ ہے ۔ سبائی راویوں اور مورخین کے پروپیگنڈے کے سوا اس کا کوئی ثبوت نہیں ۔ بلکہ اس کے غلط اور جھوٹے ہونے پر دلائل قائم ہیں ۔ ملاحظہ ہوں :۔

اولاً :۔ معترضین کہتے ہیں کہ جبل ابی قبیس پر منجنیق نصب کر کے آتش باری کی گئی ۔ آپ خود حج یا عمرے کے لئے جا چکے ہوں تو نبھا ورنہ کسی پڑھے لکھے سمجھ دار حاجی سے پوچھئے کہ جبل ابی قبیس کا فاصلہ مسجد حرام سے کتنا ہے ؟ اور پھر اندازہ کر لیجئے کہ کیا اتنے فاصلہ سے مسجد شریف کے اندر تک کوئی شعلہ آتش پہنچایا جا سکتا ہے ؟ واقعہ یہ ہے کہ اتنی دور سے شعلہ نشانہ مذکور تک پھینکنا عادتاً غیر ممکن ہے ۔ اس لئے آگ پھینکنے کی روایت بالکل غلط اور سراپا کذب و دروغ ہے ۔ جو بغض صحابہ و بغض بنی امیہ سے مغلوب شیعہ اور شیعیت نوازوں نے وضع کی ہے ۔

ثانیاً :۔ چند سطور کے بعد ہم اس خلفشار کے دوران مکہ معظمہ کے حالات "البدایہ و النہایہ" سے ان شاء اللہ نقل کریں گے ۔ ان پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حجاج کی فوجیں مسجد حرام کے دروازوں کے قریب تک پہنچ چکی تھیں ۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما انہیں منتشر کر دیتے تھے وہ پھر جمع ہو جاتی تھیں ۔ اگر آگ مسجد حرام کے اندر پہنچ سکتی تھی تو ان کے اوپر بھی گر سکتی تھی اور ان کے جسم و لباس میں بھی آگ لگ سکتی تھی ۔ تو کیا حجاج اپنی ہی فوج کو جلانا چاہتے تھے ؟ اس سے عیاں ہے کہ کعبہ پر آگ پھینکنے کی روایت بالکل غلط اور سراپا کذب و افتراء ہے ۔ اس سراپا کذب روایت کو مختلف فیہ کہنا بڑی افسوسناک جسارت ہے ۔ اس کے غلط ہونے پر ان سب اہلسنت کا اتفاق ہے جو شیعیت سے متاثر نہیں ہیں ۔ اور جن کے دل اہل ایمان کے ساتھ بغض عداوت اور حسد رکھنے کی ظلمت سے پاک ہیں ۔ اس روایت کو سامنے رکھنے سے کعبہ شریف پر منجنیق سے پتھر پھینکنے کی من گھڑت روایت کا غلط اور مکذوبہ ہونا بھی واضح ہو جاتا ہے ۔ حجاج کے لشکر کے آدمی مسجد حرام کے دروازوں کے قریب تک آئے تھے تو کیا ان کی منجنیقیں خود اپنے لشکر والوں پر پتھر پھینکتی تھیں ؟ اگر منجنیق سے کعبہ شریف پر پتھر پھینکے جاتے تو کیا اس کا خطرہ نہیں تھا کہ وہ مسجد شریف سے باہر گریں اور خود حجاج کے لشکر والوں ہی کے لئے جاں لیوا

ثابت ہوں؟ علاوہ بریں بیت اللہ کا طواف کسی وقت بھی موقوف نہیں ہوتا۔ کچھ نہ کچھ لوگ ہر وقت طواف میں مشغول رہتے ہیں۔ یہ واقعہ مشہور و معروف اور سینکڑوں کے مشاہدوں سے ثابت اور عام طور پر اہل اسلام میں تسلیم شدہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد سے کسی وقت بھی مطاف خالی نہیں رہتا۔ اور کچھ نہ کچھ لوگ طواف میں مشغول رہتے ہیں۔ اس سے صرف وہ وقت مستثنیٰ ہے جس میں کوئی فرض نماز ادا کی جاتی ہو۔ اگر کعبہ شریف پر منجنیق سے پتھر پھینکے جائیں تو طواف کرنے والوں کے زخمی ہونے یا مرنے کا قوی اندیشہ ہوتا ہے۔ طواف پر کسی طرف سے بھی کوئی پابندی نہ تھی۔ طواف کرنے والوں میں حجاج کے لشکر والے بھی ہوتے تھے۔ اس سال خود حجاج امیر الحجاج تھے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

"فلما دخل ذوالحجة حج بالناس الحجاج فی هذه السنة"

البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۳۲۵ احوال ۷۲ھ)

"ذوالحجہ کا مہینہ شروع ہوا تو حجاج نے اس سال لوگوں کو حج کرایا"

گذر چکا ہے کہ عبدالملک" نے حجاج" کو حکم دیا تھا کہ وہ مناسک حج کے مسائل میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے احکام پر عمل کریں۔ اگر بقول شیعہ و شیعہ نواز مورخین دروازہ کعبہ شریف پر دوران حج سنگ باری ہوتی رہتی تھی تو حجاج اور ان کے ساتھیوں نے طواف کیسے کیا؟ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کعبہ شریف پر اور مسجد حرام کے اندر سنگ باری کو حضرت عبداللہ" بن عمرؓ نے کیسے گوارہ کیا؟ کیا یہ الحاد فی الحرم نہیں ہے؟ اور کیا تعظیم شعائر اللہ مناسک کے حدود سے بالکل خارج اور ان سے کلیتہً بے تعلق ہے؟ اگر نہیں تو یہ بات بالکل ناقابل فہم ہے کہ حضرت عبداللہ" بن عمرؓ نے اس پر کوئی نکیر نہیں فرمائی۔ اگر نکیر کی ہوتی تو شہرت کے ساتھ منقول ہوتی۔ لیکن اس قسم کی کوئی چیز ہمیں نہیں ملتی۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کعبہ شریف پر سنگ باری کی روایت بالکل جھوٹی، موضوع، اور سبائیوں یا سبائیت نوازوں کی گڑھی ہوئی ہے۔ اور حجاج مرحوم اور ان کے لشکر والوں پر روافض کا افتراء و بہتان ہے۔

تصادم کی ابتدا

عبدالملک" اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے درمیان تصادم کی ابتداء جمادی اولی ۷۲ھ میں ہوئی تھی اور جمادی الاولی ۷۳ھ میں حضرت ابن زبیرؓ کی شہادت پر اس کا خاتمہ ہوگیا۔ گویا اس کی ابتداء اور انتہا کے درمیان ایک سال کا فاصلہ ہے۔ اس

ایک سال کے واقعات متعلقہ کی کیفیت حافظ ابن کثیرؒ نے "البدایہ والنہایہ" میں لکھی ہے۔ وہ مختصراً درج ذیل ہے۔ ۷۲ھ کے احوال کے بیان میں انہوں نے لکھا ہے کہ امیر المؤمنین عبدالملک ؒ نے حجاج ؒ کو حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ کے مقابلے کے لئے روانہ کیا۔

" فبعثه فی جیش کثیف من اهل الشام و کتب معه امانا لا هل مکة ان هم اطاعوه " (۳۲۵)

انہیں (حجاج کو) اہل شام کا ایک بڑا لشکر دے کر روانہ کیا اور اہل مکہ کے لئے امان نامہ بشرط اطاعت لکھ کر انہیں دے دیا۔ "

پھر لکھتے ہیں کہ حجاج دو ہزار شامیوں کا لشکر لے کر گئے اور طائف کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا:۔

فنزل الطائف و جعل یبعث البعوث الی عرفة و یرسل ابن الزبیر الخیل فیلتقیان فیهزم خیل ابن الزبیر و یظفر خیل الحجاج " (ص مذکور)

حجاج نے طائف میں قیام کر کے عرفہ کی طرف لشکر بھیجنا شروع کئے۔ ادھر سے ابن زبیرؓ اپنے سواروں کو بھیجتے تھے اور ادھر سے حجاج اپنے سوار بھیجتے تھے۔ حضرت ابن زبیرؓ کے سواروں کو شکست ہو جاتی تھی اور حجاج کے سوار غالب رہتے تھے۔

ان مقابلوں میں سے کسی معرکہ کا حرم شریف کے اندر ہونا کہیں سے بھی نہیں ثابت ہے۔ ذوالحجہ سے پہلے ہی یہ جنگ بند ہو گئی۔ اور محاصرہ کی ابتداء ہوئی۔ حافظ صاحب لکھتے ہیں:۔

ثم کتب الحجاج الی عبدالملک یستاذنه فی دخول الحرم و محاصرة ابن الزبیر " (ص مذکور)

" پھر حجاج نے عبدالملک کو لکھا کہ انہیں حرم میں داخل ہونے اور ابن الزبیرؓ کا محاصرہ کرنے کی اجازت دی جائے۔ "

واقدی کی روایت بحوالہ ابن کثیرؒ اوپر نقل ہو چکی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ محاصرہ ذی الحجہ کی چاند رات سے شروع ہوا۔ اس سال حج کے حالات میں لکھتے ہیں:۔

فلما دخل ذو الحجة حج بالناس الحجاج فی هذه السنة و علیه و علی اصحابه السلاح و هم وقوف بعرفات و کذا فیما بعدها من المشاعر و ابن الزبیر محصور لم یتمکن من الحج هذه السنة بل

نحر بلدنا یوم النحر و لم یتمکن کثیر ممن معہ من الحج " (ص =)

" ذوالحجہ کا مہینہ آیا تو اس سال لوگوں کو حجاج نے حج کرایا اور حجاج اور ان کے ساتھیوں نے جب عرفہ میں وقوف کیا۔ تو مسلح رہے۔ اسی طرح عرفات کے بعد والے مشاعر میں بھی یہ سب مسلح رہے اور ابن زبیرؓ محصور رہے اس سال حج نہ کرسکے مگر یوم النحر میں اونٹوں کی قربانی کی۔ اور اسی طرح ان کے بہت سے ساتھی حج نہیں کرسکے۔"

ملحوظ رہے کہ حضرت ابن زبیرؓ اور ان کے ان ساتھیوں پر جن کا تذکرہ اس روایت میں ہے حج فرض نہ تھا۔ ان پر حج فرض یہ بہت پہلے ادا کرچکے تھے' بلکہ اس کے بعد بکثرت نفل حج کرچکے تھے۔ اس لئے ان لوگوں نے اس سال حج نہیں کیا۔ حجاج کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے رفقاء میں کثیر تعداد نے حج نہیں کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ بعض نے حج کیا۔ اگر حجاج کی طرف سے کوئی مانع ہوتا تو ابن زبیرؓ کے بعض رفقاء کیسے حج کرتے؟ علاوہ بریں حضرت موصوف قربانی کیسے کرتے؟ حج کرنے والے حجاج کے لشکر کے لوگ اور دوسرے باہر کے لوگ تھے جو اس معاملے میں بالکل غیر جانبدار تھے۔ امیر الحجاج خود حجاج بن یوسف تھے جو لشکر کے سپہ سالار بھی تھے۔ اور وہ مناسک کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے تابع فرمان تھے۔ سوال یہ ہے کہ لشکر حجاج کے لوگ تو حج' طواف' سعی وغیرہ میں مشغول تھے' اس موقع پر سنگ باری کون کررہا تھا؟ مخالفین کہتے ہیں کہ پہاڑ پر منجنیق لگی ہوئی تھی جس سے سنگ باری کی گئی۔ مگر وہ سنگ باری کس نے کی؟ کیا اس وقت کوئی آٹومیٹک منجنیق ایجاد کرلی گئی تھی؟ جسے کمپیوٹر سے کنٹرول کیا جاتا تھا؟ اگر ہم یہ بھی تسلیم کرلیں تو دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مطاف' مسجد حرام مسعی (صفا و مروہ کے درمیان) وغیرہ مقامات متبرکہ میں تو حجاج کا لشکر پھیلا ہوا تھا اور خود حجاج بھی موجود تھے حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی انہیں کے ساتھ تھے پھر یہ سنگ باری کیا یہ لوگ اپنے ہی اوپر کررہے تھے؟ اور کیا حجاج نے اپنا اور اپنے لشکر والوں نیز غیر جانبدار لوگوں کا سر پھوڑنے کا حکم دیا تھا؟ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور ان کے رفقاء تو وہاں موجود ہی نہیں تھے۔ پھر یہ سنگ باری کس پر ہورہی تھی؟ عداوت بنی امیہ کے جوش میں راوی کذاب کے ہوش گم ہوگئے۔ اور اسے یہ احساس نہ ہوا کہ وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے۔

تیسرا سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ نے اس الحاد فی الحرم کو کس طرح گوارہ کیا؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اسے دیکھتے اور کوئی نکیر نہ کرتے۔

ان واضح امور پر نظر کرنے سے یہ حقیقت روشن ہوجاتی ہے کہ کعبہ شریف پر آتش باری کی کہانی کی طرح اس پر سنگ باری کرنے کی کہانی بھی بالکل غلط اور سرتاپا جھوٹ ہے جس طرح ان کہانیوں کے تراشنے اور گڑھنے والے گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوئے اسی طرح نقل کرنے والے بھی کاذب و مفتری اور گناہ کبیرہ کے مرتکب ٹھہرتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ حرم کعبہ مکرم کے اندر کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ یہ کہنا کہ "مکہ معظمہ پر حجاج نے حملہ کیا" قطعاً غلط ہے۔ ان پر اور ان کے لشکر پر یہ الزام قطعاً بہتان و افتراء ہے۔ طبری نے اپنے رفض کی وجہ سے سبائیوں کی مشہور کی ہوئی یہ جھوٹی افواہ اپنی کتاب میں درج کرلی۔ ابن اثیر شیعہ تو نہیں۔ مگر جلد اول میں عرض کرچکا ہوں کہ وہ خبرو روایت کے بارے میں غیر محتاط ہیں۔ حدیث میں بھی وہ احتیاط نہیں کرتے چہ جائیکہ تاریخ میں انہوں نے بغیر سوچے سمجھے طبری سے من گھڑت کہانیاں نقل کردیں۔ اور دل میں "دروغ برگردن راوی" کہہ کر مطمئن ہوگئے۔ "نقل راچہ عقل" پر عمل ایک مورخ کے لئے بہت بڑا نقص ہے۔ وہ شیعہ تو نہیں ہیں لیکن ان کے تالیفات دیکھ کر "سنی ذہن" رکھنے والا قاری ان کے اس نقص سے بھی انکار نہیں کرسکتا کہ ان کے ذہن پر شیعیت کا خفیف سا اثر موجود ہے۔ بنو امیہ کے ساتھ ان کا عناد' اور ان کے دل میں صحابہ کرامؓ کی قدر و عظمت کی کمی۔ ایسی چیزیں ہیں جو ان کی تحریروں سے ظاہر ہوتی ہیں۔ ان کی یہ کمزوریاں اس درجہ کی تو نہیں ہیں کہ انہیں شیعہ کہا جاسکے۔ اس سے کم درجہ کی ہیں اسی لئے ہم انہیں شیعہ نہیں کہتے مگر یہ زیر بحث قسم کے حوادث و اخبار کے بارے میں ان کی تاریخ پر بے اعتماوی پیدا کرنے کے لئے کافی ہیں۔

حصار پر کچھ مدت گزری تو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے رفقاء ان کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ حافظ صاحب لکھتے ہیں:۔

> و مازال اهل مكة يخرجون إلى الحجاج بالامان و يترو كون ابن الزبير حتى خرج اليه قريب من عشرة آلاف فامنهم و قل اصحاب ابن الزبير جدا' حتى خرج الى الحجاج حمزة و خبيب ابنا عبدالله بن الزبير فاخذا لانفسهما اماناً من الحجاج فامنهما " (البدايه والنهايه ج ۸ ص ۳۳۰)

" اہل مکہ برابر حضرت ابن زبیرؓ کا ساتھ چھوڑ کر حجاج کے پاس ان سے امان لے کر پہنچتے رہے - یہاں تک تقریباً دس ہزار آدمی نکل گئے اور ان سب کو (حجاج نے) امان دے دی - اور حضرت ابن زبیرؓ کے ساتھ بہت کم رہ گئے - یہاں تک کہ حضرت عبداللہ ابن الزبیرؓ کے دو بیٹے حمزہ اور خبیب بھی حجاج کے پاس پہنچ گئے اور ان دونوں نے اپنے لئے امان حاصل کرلی - اور حجاج نے انہیں امان دے دی -

محاصرہ تنگ ہوگیا - یہاں تک کہ حضرت ابن زبیرؓ کو مسجد حرام میں محصور کرلیا گیا - اس وقت کی کیفیت لکھتے ہیں :-

" قالو ! و کان یخرج من باب المسجد الحرام و هناک خمسمائۃ فارس و راجل فیحمل علیھم فیتفرقون عنہ یمینا و شمالا و لا یثبت لہ احدٌ ....

" و کان ابن الزبیر لا یخرج علی اھل باب الا فرقھم و بددھم و ھو غیر ملبس " ص۳۳۱ ' ۳۳۰)

" ان لوگوں نے بیان کیا ہے کہ - وہ (حضرت ابن زبیرؓ) مسجد حرام کے دروازے سے نکلتے تھے اور دروازے پر پانچ سو سوار اور پیادے جمع ہوتے تھے وہ ان پر حملہ کرتے تھے تو وہ دائیں بائیں منتشر ہوجاتے - ان کے مقابلے میں کوئی نہیں ٹھہرتا تھا - .... حضرت ابن زبیر جس دروازے کے محافظوں کے مقابلے میں بھی نکلتے تھے ؟ ان کے مجمع کو پراگندہ کردیتے تھے ' اور انہیں بھگادیتے تھے - حالانکہ وہ (حضرت ابن زبیرؓ) زرہ بھی نہیں پہنے ہوتے تھے "

اس خبر سے یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ حجاج کی فوج کے لوگ جو محاصرہ کئے ہوئے تھے حرم میں خون نہیں بہانا چاہتے تھے - اور حضرت ابن زبیرؓ کے قتل کرنے یا انہیں زخمی کرنے کا ارادہ نہ رکھتے تھے - ورنہ پانچ سو آدمیوں کا ایک شخص کے سامنے سے ڈر کر بھاگ جانا بالکل بعید از عقل و قیاس ہے - خصوصاً جب ان میں سوار بھی ہوں اگر ان کی نیت قتل و خونریزی کی ہوتی تو وہ انہیں آسانی کے ساتھ قتل کرسکتے تھے خصوصا ایسی صورت میں جبکہ ان کے ساتھی ' یہاں تک کہ ان کے بیٹے بھی ان کا ساتھ چھوڑ چکے تھے

علی ھذا روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن زبیرؓ بھی کسی کو قتل یا مجروح نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ورنہ کم از کم ایک دو کو تو وہ قتل یا مجروح کر ہی سکتے تھے۔ خصوصاً جبکہ بظاہر مخالفین کے یہ سپاہی ان سے مرعوب بھی تھے۔ اور اسلحہ کے استعمال سے گریز کررہے تھے۔ حضرت ابن زبیرؓ کا یہ رویہ بھی احترام حرم کی وجہ سے تھا۔ وہ اپنے دشمنوں کی طرح خود بھی حرم شریف میں کسی کو قتل یا زخمی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ محض خالی ہاتھ دفاع کرنا چاہتے تھے یعنی مخالفین کو دھکے دے کر دروازہ پر سے ہٹانا چاہتے تھے۔ مگر حجاج کے لشکر والوں نے اس کی بھی نوبت نہ آنے دی۔ وہ حضرت ابن زبیرؓ کے قریب ہی نہ آتے تھے بلکہ پہلے ہی بھاگ جاتے تھے۔ اسی سلسلہ کی ایک روایت میں آتا ہے کہ:۔

" و لقد کان حجر المنجنیق یقع علی طرف ثوبہ فلا ینزعج بذالک "

" منجنیق کے پتھر آں محترم کے دامن پر لگتے تھے مگر اس سے آں محترم کو کوئی ہچکچاہٹ نہیں پیدا ہوتی تھی "۔

یہ روایت قوسین کے درمیان لکھ کر حاشیہ پر ناشر نے لکھا ہے کہ یہ " البدایہ و النھایہ " کے مصری نسخہ میں موجود نہیں ہے۔ تاہم اگر اس روایت کو ثابت تسلیم کرلیا جائے تو یہ بھی اس امر کی ایک دلیل ہے کہ حجاجؒ کے لشکر والے حضرت ابن زبیرؓ کو قتل یا زخمی نہیں کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ورنہ تاک کر پتھر پھینکنا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ پتھران کے دامن پر لگتا تھا مگران کے جسم کو چھوتا بھی نہ تھا؟ اگر انہیں قتل یا مجروح کرنا مقصود ہوتا تو منجنیق کے بجائے، ہاتھوں سے پتھر مارے جاسکتے تھے۔ تیر سے بھی کام لیا جاسکتا تھا۔ پانچ سو میں سے سو دو سو آدمی بھی سنگ باری کرتے تو آں محترم کا ان سے محفوظ رہنا غیر ممکن تھا۔ خصوصاً جبکہ موصوف کے جسم پر زرہ بھی نہیں تھی۔ اس سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ فریقین میں سے کوئی بھی حرم محترم میں خوں ریزی اور جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا اور حرم میں درحقیقت کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ یہ پتھر پھینکنا ایسا ہی تھا جیسے آج کل مجمع کو منتشر کرنے کے لئے ہوائی فائر کئے جاتے ہیں۔ حجاج کے لشکر والے یہ چاہتے تھے کہ حضرت ابن زبیرؓ حرم میں محصور رہیں۔ اور ہم پر حملہ نہ کرسکیں، نیز کسی دوسری جگہ نہ جاسکیں۔

حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ کی شہادت

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے ۱۷ جمادی الاول ۷۳ ھ کو جام شہادت نوش

فرمایا - پوری رات نمازیں پڑھتے رہے - صبح کے قریب ذرا سی جھپکی لی - بیدار ہو کر اول وقت فجر کی نماز طول قنوت کے ساتھ ادا کی اپنے رفقاء کا جائزہ لیا اس کے بعد محاصرہ کرنے والوں پر اپنے رفقاء کو ساتھ لے کر حملہ آور ہوئے ' فوج مخالف تتر بتر ہو گئی اور آن محترم - اپنے رفقاء کے ساتھ ان کا پیچھا کرتے ہوئے مقام الحجون تک پہنچ گئے - وہاں ایک اینٹ آکر چہرہ مبارک پر لگی - جس سے خون بہنے لگا - اس پر آں محترم نے ایک رجزیہ شعر پڑھا ' اس کے بعد گر گئے (۱) ان واقعات کے تذکرے کے بعد حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں

" ثم سقط إلى الأرض فلسر عوا إليه فقتلوه " (ص ۳۳۱)

" پھر آں محترم زمین پر گر گئے (یہ دیکھ کر) وہ لوگ (لشکر حجاج کے لوگ) جلدی سے دوڑے اور انہیں قتل کر دیا - "

پھر ایک صفحہ کے بعد ص ۳۳۲ پر آں محترم کے سر کاٹنے ' اور دمشق بھیجنے ' جسم سولی پر لٹکانے ' کی غلط موضوع ' جعلی روایتیں بھی نقل کی ہیں - شیعوں کی گڑھی ہوئی ان سب روایتوں کا غلط اور بہتان خالص ہونا انشاء اللہ مندرجہ ذیل سطروں سے واضح ہو جائے گا -
اس روایت میں اتنی بات تو صحیح معلوم ہوتی ہے کہ چہرے پر اینٹ لگنے سے حضرت موصوف زمیں پر گر پڑے - لیکن یہ بات کہ " لشکر مخالف کے لوگ دوڑ پڑے اور انہیں قتل کر دیا - " بوجوہ غلط معلوم ہوتی ہے - قرین قیاس یہ ہے کہ اسی " اینٹ " کے لگنے سے آں محترم کی وفات ہوئی - چوٹ اور زخم لگنے سے خون زیادہ نکل گیا - جس کی وجہ سے وفات ہو گئی - اور آں محترم مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے - رضی اللہ عنہ و ارضاہ - مخالفین لشکر والوں نے انہیں قتل نہیں کیا - روایت کا یہ حصہ " فلسر عوا الیہ فقتلوہ " بالکل غلط اور کسی سبائی یا سبائیت نواز راوی یا مورخ کا اضافہ ہے جو اس نے اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے -

مندرجہ ذیل قرائن ہماری رائے کی تصدیق اور روایت زیر بحث کے حصہ مذکور کی تکذیب کر رہے ہیں :-

اول :- اس آخری کشمکش میں بھی فریقین کے درمیان کوئی جنگ نہیں ہوئی - دونوں نے حرم کے احترام کی وجہ سے اسلحہ سے کوئی کام نہیں لیا - اس روایت میں اس حادثہ کے متعلق صرف اتنا کہا گیا ہے -

---

(۱) البدایہ و النہایہ ص ۳۳۱ ج

"ثم نهض و حمل و حملوا حتی کشفوهم الی الحجون" (ص ۳۳۱)

پھر (حضرت ابن زبیرؓ) اٹھے اور آں محترم نے نیز ان کے رفقاء نے حملہ کیا یہاں تک کہ دشمنوں کو "حجون تک پسپا کردیا۔"

اس روایت میں نہ تو کسی کے قتل کا تذکرہ ہے نہ زخمی ہونے کا نہ کسی سلاح کے استعمال کا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جنگ نہیں ہوئی فریقین نے حرم شریف کی حرمت و عظمت کا پاس و لحاظ کیا۔ اور کسی نے ایک دوسرے پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ حسب سابق (جیسا کہ مذکور ہوچکا ہے) حضرت ابن زبیرؓ ان کی طرف بڑھتے تھے اور وہ لوگ بھاگ جاتے تھے۔ حرم مکہ کے اندر کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ اس سے عیاں ہے کہ لشکر حجاج انہیں قتل نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ صرف محصور کرکے ان سے ہتھیار ڈلوانا اور صلح پر آمادہ کرنا چاہتا تھا۔ جب لشکر کا یہ رجحان تھا تو یہ بات بعید از قیاس ہے کہ انہوں نے آں محترم کو گرتا ہوا دیکھ کر ان کے قتل کا ارادہ کرلیا ہو اور انہیں شہید کردیا ہو۔ خصوصاً جبکہ انہیں توقع ہو کہ اینٹ کی چوٹ ہی سے ان کی وفات ہوجائے گی۔ اگر یہ کہا جائے کہ "یہ واقعہ حرم مکہ سے باہر کا ہے۔ حرم کے اندر تو ان لوگوں نے احترام حرم کی وجہ سے ان کے قتل کا ارادہ نہیں کیا لیکن ممکن ہے کہ جب وہ حرم سے باہر آگئے تھے تو ارادہ قتل کرلیا ہو"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ اور ان کے رفقاء کی طرح حجاجؒ اور لشکر حجاجؒ کو بھی احترام حرم کا پورا پورا پاس و لحاظ تھا۔ اسی وجہ سے حرم شریف میں فریقین کے درمیان کوئی جنگ نہیں ہوئی کسی نے اسلحہ سے کام نہیں لیا۔ نہ کسی نے کسی کو مجروح کرنے کی کوشش کی۔ لیکن حجاجؒ کی فوج کا دوران محاصرہ جو رویہ رہا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف احترام حرم ہی اس کا سبب نہ تھا بلکہ وہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو قتل یا مجروح کرنا ہی نہ چاہتے تھے۔ بلکہ اس سے گریز کرتے تھے۔ اگر وہ اس سے بچنا نہ چاہتے' یا اس کے خواہاں ہوتے تو پانچ ماہ کے محاصرے کے دوران کسی موقع پر تو وہ اس کی کوشش کرتے کہ حضرت موصوف کو اپنے پیچھے لگا کر حرم مکہ سے باہر لے آئیں اور وہاں حملہ کرکے انہیں شہید کردیں۔ مگر اس قسم کی کسی کوشش کا کوئی ثبوت بھی نہیں ملتا بلکہ کوئی ایسی بات بھی نہیں ملتی۔ جس سے ان لشکر والوں پر اس کا شبہ بھی کیا جاسکے۔ اس سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ حجاجؒ اور اس کے لشکر والے سب حضرت ابن زبیرؓ کی عظمت کے قائل تھے اور ان کے قتل یا انہیں مجروح کرنے سے سخت کارہ تھے۔

وہ قطعاً انہیں جانی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ اس لئے یہ بات بالکل بعید از قیاس ہے کہ انہوں نے آں محترم کو شہید کیا ہو۔

دوم :۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اس موقع پر تنہا نہیں تھے۔ ان کے ساتھ ان کا لشکر تھا ان کی تعداد اگرچہ بہت کم تھی مگر پھر بھی معتدبہ تھی۔ جب بقول راوی مخالفین دوڑ کر انہیں قتل کرنے کے لئے آئے تو ان کے رفقاء نے کیا کیا؟ انہوں نے آں محترم کی حفاظت اور ان کی طرف سے مدافعت کی یا نہیں؟ اس کا کوئی تذکرہ کسی روایت میں نہیں ۔ اگر کوئی مدافعت کی ہوتی تو ضرور اس کا تذکرہ ہوتا۔ یہ بھی بالکل بعید از عقل و قیاس ہے کہ انہوں نے کوئی مدافعت نہ کی ہو۔ اور اسے گوارہ کرلیا ہو کہ ان کے منتخب کئے ہوئے خلیفہ اور امیر کو ان کے دشمن ان کے سامنے ذبح کریں۔ یہ بات تو غیرت وحمیت، خلوص اور وفاداری کے بالکل منافی اور مخالف ہے۔ بلکہ ایک قسم کا غدر ہے۔ جو جائز بھی نہیں۔ بلکہ سخت مذموم اور معصیت کبیرہ ہے۔ ان واقعات پر نظر کرنے سے یقینی طور پر یہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ حجاجؒ کے لشکر والوں نے آں محترم کو قتل کرنے کا کوئی ارادہ یا اقدام نہیں کیا۔ اور قتل والی روایت بالکل جھوٹی، غلط اور جعلی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ آں محترم کی وفات اسی "اینٹ" کے لگنے سے ہوئی، اس کی چوٹ کھاکر جب موصوف گرپڑے تو کوئی بھی موصوف کے قتل کرنے کے لئے نہیں آیا بلکہ خون زیادہ نکل جانے کی وجہ سے آں محترم کا انتقال ہوگیا۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

سوم :۔ حجاجؒ قریشی نہیں تھے۔ ان کے لشکر میں بھی قریشی خال خال ہی ہوں گے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ عبدالملک کے قریبی رشتہ دار اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی بھی تھے۔ حجاجؒ اور ان کے لشکر کے کسی شخص کی یہ جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ انہیں خلیفۃ المسلمین کی اجازت کے بغیر قتل کردے۔ عبدالملک نے ان کے محاصرے کی اجازت دی تھی۔ قتال و قتل کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس لئے وہ کسی طرح ان کے قتل کی جرأت نہیں کرسکتے تھے۔ انہیں قتل کرنے کی روایت قطعاً غلط ہے جو کسی سبائی یا سبائیت نواز نے گھڑی ہے۔

قتل کی روایت سراپا کذب و افتراء اور من گھڑت ہونا تو روز روشن کی طرح عیاں ہوگیا۔ اور یہ بات صاف ہوگئی کہ حضرت ابن زبیرؓ کی شہادت اس "اینٹ" کے لگنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ لیکن وہ "اینٹ" کہاں سے آئی تھی۔ اس سوال کا کوئی واضح جواب نہیں ملتا۔ لیکن دشمنان بنی امیہ بھی یہ نہیں کہہ سکے کہ وہ اینٹ لشکر حجاجؒ میں سے کسی نے پھینکی

تھی۔ بلکہ اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ کسی نے بھی قصداً ان کی طرف اینٹ نہیں پھینکی تھی۔ اتفاقی طور پر ان کے لگ گئی۔ پھر بھی یہ بات راز ہی رہتی ہے کہ وہ "اینٹ" کس نے پھینکی تھی؟ اور کس طرف سے آئی تھی؟

سبائی سازش

حافظ ابن کثیر اس واقعہ کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں :۔

"فجاءته آجرة فاصابته فی وجهه فارتعش بها .... ثم سقط الی الارض" (ص ۳۳۱ ج ۸)

"ایک اینٹ ان کے چہرے پر لگی۔ انہیں اس سے جھرجھری آئی ...... پھر وہ زمین پر گر پڑے۔"

اینٹ کس نے پھینکی؟ کدھر سے آئی؟ اس کی طرف اس روایت میں اشارہ تک نہیں ملتا۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ حجاج کے لشکر والوں میں سے کسی نے "اینٹ" نہیں پھینکی تھی۔ حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ کے واقعہ شہادت کے بارے میں مختلف و متناقض روایتیں ہیں۔ صحیح روایت صرف وہی ہے جو حافظ ابن کثیر نے لکھی ہے۔ اور اوپر منقول ہوئی۔ باقی روایتیں غلط ہیں۔ اور جمہور مورخین کے نزدیک قابل تسلیم نہیں ہیں۔

اسی قسم کی ایک روایت البدایہ میں حافظ صاحب نے طبرانی سے نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن زبیرؓ کے اعوان و مددگار لشکر حجاجؒ پر خشت باری کر رہے تھے انہیں کی پھینکی ہوئی ایک اینٹ اتفاقی طور پر حضرت ابن زبیرؓ کے سر مبارک میں لگی۔ جس سے سر کھل گیا۔ اور گہرا زخم آیا۔ یہ روایت تو غلط ہے۔ (۱) لیکن اس سے اس

---

(۱) اس لئے کہ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ اینٹیں مسجد حرام کی پشت (عقب) کی طرف سے پھینکی جارہی تھیں۔ اور یہ قطعاً غلط ہے۔ اس لئے کہ مسجد کے چاروں طرف دروازے ہیں۔ اور اس کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جسے پشت مسجد کہا جاسکے۔ دوسرے یہ کہ مسجد کے دروازے پر چاروں طرف حجاجؒ کے سپاہی جمع تھے اور پہرہ دے رہے تھے۔ پھر کسی طرف سے اینٹیں پھینکنے کا موقع کیسے مل سکتا تھا؟ تیسرے یہ کہ اگر بقول راوی لشکر حجاجؒ اندرون مسجد گیا تھا جہاں ابن زبیرؓ کے اعوان و انصار بھی تھے تو اس طرح خشت باری سے اپنے ہی معاونین کے زخمی یا مقتول ہونے کا شدید خطرہ تھا۔ ایسی صورت میں وہ لوگ خشت باری کیسے کرسکتے تھے؟

بات کا پتہ چلتا ہے کہ جب یہ روایت گھڑی گئی تھی اس وقت عام طور پر لوگ "خشت باری کو لشکر حجاج کی طرف نہیں منسوب کرتے تھے۔ نیز یہ سمجھتے تھے کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ اور کم از کم اس کا احتمال ہے کہ یہ "اینٹ" حضرت موصوف کی جماعت والوں اور طرف داروں ہی نے دشمنوں کی طرف پھینکی ہو۔ جو اتفاق سے موصوف کے لگ گئی۔

یہاں تک پہنچنے کے بعد کم از کم ظن غالب کی حد تک اس راز کی نقاب کشائی ہو جاتی ہے۔ واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ سبائی سازش کے کچھ ارکان تقیہ کرکے مکہ معظمہ میں مقیم ہوں گے۔ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے رفقاء کے ساتھ گھل مل کر رہتے ہوں گے۔ حضرت ابن زبیرؓ کے ساتھ ساتھ الحجون تک گئے اور کہیں چھپ کر موقع پاکر یہ اینٹ انہیں میں سے کسی نے پھینکی ہوگی۔ جو آں محترم کی وفات و شہادت پر منتج ہوئی۔ جو لوگ شیعیت کے مزاج سے واقف ہیں وہ ہماری اس بات کو بلا شک و شبہ تسلیم کریں گے۔

قتل کی روایت غلط ثابت ہونے کے بعد لاش کی بے حرمتی کی روایتوں کا غلط ہونا خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ تاریخ اسلام کے طالب علم کو یہ اصول ملحوظ رکھنا چاہئے کہ تاریخ اور حدیث کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔ حدیث کی روایت میں راوی جس قدر احتیاط کرتا ہے۔ تاریخ کا راوی اس کی عشر عشیر احتیاط بھی نہیں کرتا۔ تاریخی روایت کی صحت و غلطی متعین کرنے میں قرائن داخلی و خارجی کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اور در حقیقت فیصلہ قرائن ہی کے اختیار میں ہوتا ہے۔ رواۃ کا ثقہ ہونا کسی تاریخی روایت کی صحت کے لئے کافی نہیں۔ جب تک قرائن بھی اس کی تائید نہ کرتے ہوں یا کم از کم اس کی نفی نہ کرتے ہوں اور اس کے خلاف نہ ہوں۔ کسی تاریخی روایت کے سب راوی ثقہ ہوں، مگر قرائن قویہ اس روایت کو غلط ثابت کر رہے ہوں۔ تو اسے یقیناً غلط اور مردود سمجھا جائے گا۔ اور اسے محض ثقات کی روایت ہونے کی بناء پر قبول نہیں کیا جا سکتا۔ حدیث اور تاریخ میں یہ فرق پیش نظر رکھنا لازم ہے۔ حدیث کی صحت و عدم صحت کی جانچ کرنے کے لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس کے راویوں کے احوال معلوم کریں۔ قرائن کو اس میں بھی اہمیت حاصل ہے مگر اس کا درجہ احوال رواۃ کے بعد ہے۔ بخلاف اس کے تاریخ میں قرائن ہی کو اہمیت حاصل ہے۔ اس میں راویوں کی جانچ ثانوی چیز ہے۔ اس کی ایک قوی وجہ یہی ہے کہ تاریخی روایتوں کے بارے میں بڑے بڑے ثقہ اور عادل اشخاص بھی اکثر و بیشتر غیر محتاط ہوتے ہیں، نسلی عصبیت، جماعتی و تحریکی تعصب، سیاسی اختلافات اور اس قسم کے دوسرے حالات و جذبات بعض اوقات غالب ہو کر ماضی کی خبروں کے بارے

میں بڑے بڑے ثقات کو انتہائی بد احتیاطی کرنے یہاں تک کہ کھلا ہوا جھوٹ بولنے اور افتراء کرنے پر آمادہ کر دیتے ہیں۔

یہ واقعہ تنہا میں نے نہیں بلکہ بہتوں نے دیکھا ہے اور دیکھتے رہتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ سیاسی معاملات اور اختلافات کی صورت میں۔ اس بارے میں احتیاط کرنے والے مفقود تو نہیں مگر بہت قلیل ہیں۔ ان امور پہ نظر کرنے کے بعد کوئی ایسی تاریخی روایت جو اگرچہ ثقات سے مروی ہو مگر قرائن اس کی تکذیب کر رہے ہوں قطعاً قبول نہیں کی جاسکتی اور اس پر قطعاً اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ مطالعہ یا تاریخ میں اس اصول کا ملحوظ رکھنا لازم ہے۔ ورنہ سخت غلطیوں اور غلط فہمیوں میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔ مطالعہ تاریخ کے اس اہم اصول کی وضاحت کے لئے اگرچہ ہم نے زیر بحث روایتوں کے راویوں کو ثقہ فرض کیا تھا۔ لیکن حقیقت واقعہ یہ ہے۔ کہ ان سب کے راوی عام طور پر مجہول' شیعہ یا شیعیت نواز ہیں۔ یہ جھوٹ بولنے اور جھوٹی روایتیں نقل کرنے میں مشاق تھے۔ بنو امیہ سے بغض و عداوت کی وجہ سے ان کے خلاف زہر اگلنے اور ان پر بہتان و افتراء کرنے میں انہیں کوئی ہچکچاہٹ نہیں محسوس ہوتی تھی۔ ایسے لوگوں کی خبر جو قرائن کے خلاف ہو کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اس اہم اصول کو سامنے رکھ کر مندرجہ ذیل قرائن پر غور کیجئے جو زیر بحث روایتوں کی تکذیب کر رہے ہیں۔

اول :۔ چند سطریں پہلے یہ ثابت کیا جاچکا ہے کہ حجاجؒ کے لشکر کے لوگ حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ کو قتل یا مجروح نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کی عظمت بھی لشکر والوں کے دلوں میں تھی۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ انہوں نے آں محترم کی لاش کی بے حرمتی کی ہو؟ ان کا سر کاٹا ہو اور لاش سولی پر چڑھائی ہو؟ اس سے عیاں ہے کہ یہ روایتیں بالکل غلط ہیں۔

دوم :۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما وہاں موجود تھے۔ حضرت ابن زبیرؓ کی شہادت کا واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ آں محترم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور قریبی رشتہ سے بھتیجے تھے' دوسرے رشتے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابن زبیرؓ کے خالو تھے۔ آں محترم کی شہادت کی خبر بہت تیزی کے ساتھ مکہ مکرمہ میں پھیل گئی ہوگی' اور لاش کے قریب لوگوں کے ٹھٹھ لگ گئے ہوں گے۔ یہ بالکل بعید از قیاس ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ جائے حادثہ پر اتنی تاخیر کے ساتھ پہنچے ہوں کہ ان کا سر بھی کاٹا جاچکا ہو۔ اور ان کی لاش کو مقام "کدا" پر لے جاکر صلیب پر لٹکایا جاچکا ہو۔ یقیناً حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ فوراً پہنچے ہوں گے۔ پھر انہوں نے حضرت ابن زبیرؓ کی لاش

کی یہ بے حرمتی کیسے گوارا کی ؟ اور حجاجؒ یا ان کے لشکر والوں کی یہ جرأت کیسے ہوئی کہ حضرت ابن زبیرؓ کی لاش کی بے حرمتی کریں ؟ اگر اس قسم کا کوئی واقعہ ہوا ہوتا یا اس کا کسی نے ارادہ کیا ہوتا تو یقیناً حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ اسے سختی کے ساتھ منع کرتے اور نہی عن المنکر کے فریضے سے غفلت نہ برتتے ۔ مگر اس مضمون کی کوئی روایت تاریخ میں موجود نہیں ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سر کاٹنے ' اسے دمشق بھیجنے ' جسم بے سر کو سولی دینے اور اس قسم کی دوسری روایتیں قطعاً غلط جھوٹی اور شیعوں نیز شیعیت نوازوں کی گھڑی ہوئی ہیں ۔ اللہ تعالٰی ان کذابوں کو رسوا کرے ۔

سوم :۔ اوپر مذکورہ ہو چکا ہے کہ مکہ سے تقریباً دس ہزار آدمی امان لے کر لشکر حجاجؒ میں پہنچ چکے تھے ۔ ان میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے دو بیٹے حمزہ و خبیبؒ بھی تھے ۔ ان لوگوں نے ان کی لاش کی یہ بے حرمتی کیسے گوارا کی خصوصاً آں محترم کے بیٹوں سے باپ کی لاش کا سر کٹتے اور اسے سولی پر لٹکتے کیسے دیکھا گیا ؟ اگر اس قسم کا واقعہ ہوا ہوتا تو یقیناً ان لوگوں نے حجاجؒ کو اس سے منع کیا ہوتا اور اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا ہوتا حالانکہ اس قسم کی کوئی روایت موجود نہیں ہے ۔ یہ اس امر کا قوی قرینہ ہے کہ اس قسم کا کوئی واقعہ قطعاً نہیں ہوا ۔ بلکہ حجاجؒ نے اس کا کوئی ارادہ بھی نہیں کیا ۔ سر کاٹنے اسے تشہیر کرنے اور لاش کو سولی دینے کی روایتیں قطعاً غلط سبائی سانچے میں ڈھلی ہوئی سراپا کذب و دروغ کہانیاں ہیں ۔ جن کی کوئی اصل و بنیاد نہیں ۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ لوگ حجاجؒ کے خوف کی وجہ سے خاموش رہے ۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح انہیں حجاجؒ کا خوف ہو سکتا تھا اسی طرح حجاج بھی ان سے خائف ہو سکتے تھے ۔ اندرون لشکر اگر دس ہزار میں سے ۲ ہزار آدمی بھی تلواریں سونت لیتے تو حجاجؒ کے لئے لینے کے دینے پڑ جاتے ۔ وہ ایک مدبر اور ذہین شخص تھے ۔ ان حالات میں قطعاً ایسی کوئی بات نہیں کر سکتے تھے ۔ جس سے ان امان حاصل کرنے والوں میں اشتعال پیدا ہو ۔ اول تو پر کاہ کے برابر بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ حجاجؒ کی نیت حضرت ابن زبیرؓ کی لاش کی توہین کرنے کی تھی ۔ لیکن بالفرض کفرض المحال ۔ ان کی نیت بھی ہوتی تو بھی وہ اس پر عمل تو کجا اس کا اظہار بھی نہیں کر سکتے تھے ۔ کیونکہ اس صورت میں امان لینے والوں کی بغاوت کا اندیشہ تھا ۔ یہی نہیں بلکہ اس صورت میں خود ان کا لشکر ان کے خلاف ہو جاتا ۔ وہ صرف محاصرے کے لئے آئے تھے ۔ انہیں قتل کرنے نہیں آئے تھے ۔

چہارم :۔ خود حجاجؒ کا لشکر حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ کا مداح ان کی عظمت ' اور ان کے

مقبول بارگاہ الٰہی ہونے کا قائل تھا۔ اسی لئے اس نے کسی موقع پر بھی ان سے مقابلے کی جسارت نہیں کی۔ انہیں دیکھ کر سب محاصرے کرنے والے بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ صرف ہاتھ پاؤں' سے غیر مسلح تصادم کی نوبت بھی نہیں آئی۔ اور محاصرہ کرنے والوں نے ان کا ادب ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ اس لشکر کے ایک سردار طارق نے حضرت ابن زبیرؓ کی لاش کے پاس کھڑے ہوکر حجاجؒ کے سامنے کہا کہ "کسی عورت نے اس سے زیادہ جوانمرد نہیں جنا ہے"۔ (۱) خود حجاجؒ بھی حضرت ابن زبیرؓ کی عظمت اور ان کی ولایت کے قائل تھے۔ چنانچہ انہوں نے فتح کے بعد جو تقریر کی اس میں حضرت ابن زبیرؓ کو "من خیار الناس" (بہترین لوگوں میں سے ایک) کہا ہے۔ ایسے لوگوں کا آں محترم کی لاش کے ساتھ توہین آمیز سلوک کرنا بالکل بعید از قیاس و عقل ہے۔

مودودی صاحب نے بڑے طمطراق کے ساتھ حجاجؒ مرحوم کے خلاف بعض بزرگ ہستیوں کے اقوال نقل کئے ہیں کہ:

> "مشہور امام قرات عاصم بن ابی النجود کہتے ہیں کہ "اللہ کی حرمتوں میں سے کوئی حرمت ایسی نہیں رہ گئی جس کا ارتکاب اس شخص نے نہ کیا ہو"

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کہتے ہیں کہ: "اگر دنیا کی تمام قومیں خباثت کا مقابلہ کریں اور اپنے اپنے سارے خبیث لے آئیں تو ہم تنہا حجاجؒ کو پیش کر کے ان پر بازی لے جاسکتے ہیں۔" (ص ۱۸۵ و ص ۱۸۶)

اسی طرح موصوف نے ذم حجاجؒ میں امام شعبی کا قول بھی نقل کیا ہے۔

○ تبصرہ:۔ شیعوں اور ان کے ساتھ تحریک شیعیت میں شرکت کرنے والے علویوں کے جھوٹے پروپیگنڈے اور ارجاف کا اتنا اثر ہوا کہ بنو امیہ کی مذمت کرنا اور ان کے خلفاء و عمال کو ظالم و جابر کہنا فیشن میں داخل ہوگیا۔ خصوصیت کے ساتھ حجاجؒ مرحوم کی مذمت تو ہر وہ شخص واجب و لازم سمجھتا ہے جو تاریخ اسلام کے متعلق کچھ لکھتا ہے۔ یا تقریر کرتا ہے۔ مودودی صاحب جو نسلی تعصب جاہلی سے مغلوب تھے اس تبرا بازی سے کیسے باز رہ سکتے تھے۔ اس تبرا بازی سے اس قسم کے لوگوں کو یا دوسرے مسلمانوں کو فائدہ تو کچھ بھی نہیں پہنچتا۔ ہاں غیبت بلکہ بہتان کا گناہ ہوتا ہے۔ اور ناواقف مسلمانوں کو یہ نقصان پہنچتا

---

(۱) البدایہ و النہایہ ج ۸ ص ۳۳۱

ہے ۔ کہ انہیں اپنی تاریخ کے متعلق بدگمانی پیدا ہوتی ہے اور ان کے اس قابل تحسین جذبہ فخر کو ٹھیس لگتی ہے جو اپنی درخشاں اور شاندار تاریخ پر ان کے دلوں میں موجزن ہے اور جو ہر طرح صحیح اور بجا ہے ۔

بنو امیہ اور حجاجؒ مرحوم کی مذمت میں جن لوگوں کے اقوال مودودی صاحب نے نقل کئے ہیں ' اگر ان کی طرف ان اقوال و بیانات کی نسبت صحیح ہے تو ایک عام مسلمان کے دل میں یہ سوال پیدا ہونا ناگزیر ہے کہ کیا یہ بزرگان سلف بھی " تبرا بازی " کے خوگر تھے؟ اور کیا یہ حضرات غیبت و بہتان کو " تقویٰ " کے منافی نہیں سمجھتے تھے ۔ ؟

اگر یہ بدگوئی کسی شرعی مصلحت و ضرورت کی بناء پر تھی تو وہ معلوم ہونا چاہئے بظاہر تو کوئی مصلحت نظر نہیں آتی ۔ عاصم بن ابی النجود نے مبینہ طور پر جس زمانہ میں حجاجؒ کی غیبت یا ان پر بہتان باندھنے کا ارتکاب کیا ہے اس وقت خلافت امویہ کو زوال ہو چکا تھا ۔ پھر ان کی مذمت کرنے سے کیا فائدہ تھا ؟

ان کے بعد سب سے زیادہ شدت کے ساتھ خلافت اور حجاجؒ کی مذمت کرنے والے مبینہ طور پر عمر بن " عبدالعزیز ہیں ۔ یہ امیر المومنین عبدالملک " کے زمانہ میں جوان تھے ۔ حجاجؒ کا دور ان کے سامنے گذرا ۔ خاندان میں ان کا اتنا اثر تھا کہ ہشامؒ نے انہیں اپنا ولی عہد بنایا ۔ یہ اپنے زہد و تقویٰ میں ممتاز و معروف ہیں ۔ ہر مسلمان ان سے پوچھ سکتا ہے کہ حضرت اس دوران آپ کیا کرتے رہے ؟ آپ کا منصب تو یہ تھا کہ آپ اس گریہ و بکا اور مشق تبرا کے بجائے حجاجؒ پر علی الاعلان نکیر کرتے ' امیر المومنین عبدالملک سے ان کی شکایت کرکے انہیں معزول کراتے ' یہ سب آپ کرسکتے تھے مگر انسداد ظلم کے لئے آپ نے یہ کیوں نہ کیا ؟ خلافت امویہ ' اور حجاجؒ کے مخالفین حضرت حسن " بصری کا جو طرز عمل ان کے متعلق دکھایا ہے وہ عجیب و غریب ہے ۔ ایک طرف وہ حجاجؒ اور اموی خلافت پر تبرا بھیجتے ہیں اور دوسری طرف امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضے سے گریز کرنے کے ساتھ خلافت بنی امیہ کی امداد و اعانت بھی کرتے ہیں اور اس کے خلاف بغاوت کچلنے میں اس کے مددگار بن جاتے ہیں ۔ امام شعبی کا مسئلہ بھی تقریباً اسی نوعیت کا ہے ۔ ان کا انتقال بعمر اسیؒ سال پہلی صدی ہجری گذرنے کے بعد ہوا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے حجاجؒ اور عبدالملک " کا زمانہ پایا ہے ۔ اور ان ادوار میں وہ عاقل بالغ تھے ۔ پھر انہوں نے حجاجؒ اور عبدالملک پر نکیر کیوں نہیں کی ؟ ان کی پوزیشن اس قدر اونچی تھی کہ انہیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے سے پیشتر حجاجؒ اور عبدالملک کو بھی سوچنا پڑتا ۔

اور تا بہ امکان وہ انہیں کوئی نقصان یا تکلیف پہنچانے سے گریز کرتے۔ تبرا پڑھنے کے بجائے ان دونوں صاحبان کو تو چاہئے تھا کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے اور قولاً و عملاً ہر طرح ظلم بند کرنے کی کوشش کرتے۔ مگر انہوں نے یہ نہیں کیا۔ اگر کیا ہوتا تو ثابت ہوتا۔

مختصر یہ کہ جن بزرگان ملت کی زبان سے مودودی صاحب اور ان کے ہم مشرب علماء و مورخین، حجاج اور خلفاء بنی امیہ کی مذمت نقل کرتے ہیں۔ اور انہیں ظالم و جابر کہلواتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کے متعلق بھی یہ ثابت نہیں کہ اس نے حجاج یا عبدالملک پر یا کسی دوسرے خلیفہ پر اس کے مبینہ ظلم و جور یا فسق و فجور کے بارے میں نکیر کی ہو۔ یا انہیں ظلم و معصیت سے باز رہنے کی نصیحت کی ہو۔ بلکہ عموماً یہ حضرات حجاج و عبدالملک اور دوسرے عمال و خلفاء بنی امیہ سے مالی امداد حاصل کرتے تھے۔ پھر ایسے حضرات کی بات پر کیسے اعتبار و اعتماد کیا جائے؟

جس طرح یہ ممکن ہے کہ یہ حضرات بخوف حجاج حق بات کہنے اور مظلوموں کی حمایت و نصرت کرنے سے باز رہے ہوں اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ یہ صاحبان حجاج اور عبدالملک کے خلاف یہ تبرا بخوف عوام کرتے ہوں۔ چونکہ شیعوں اور عباسیوں کے ایجنٹوں نے خلافت بنی امیہ کے خلاف غلط باتوں اور بے بنیاد الزاموں کی تشہیر بہت زیادہ کی تھی، اس لئے عوام کا ایک طبقہ ان کا مخالف ہوگیا تھا۔ اس طبقہ کے خوف کی وجہ سے ان لوگوں نے اپنے ضمیر اور حقیقت واقعہ کے خلاف یہ تبرا بازی کی ہو۔ کیا یہ ممکن نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ جب یہ ناممکن ہے تو ان کے اقوال مذکورہ اور اسی طرح کے دوسرے اقوال قطعاً ساقط الاعتبار کیے جائیں گے۔

یہ گفتگو تو ہم نے یہ فرض کر کے تھی کہ یہ اقوال اور ان کے امثال جو مذکورہ بالا یا ان جیسے دوسرے بزرگوں کی طرف منسوب کئے گئے ہیں انہیں کے اقوال ہیں اور ان سے ثابت ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہ مفروضہ ہی قطعاً غلط ہے۔ یہ ان حضرات کے اقوال و آراء قطعاً نہیں ہیں۔ بلکہ سبائیوں اور تحریک شیعیت کے حامیوں کے وضع کئے ہوئے اور گڑھے ہوئے جملے ہیں، جو ان کذابوں نے ان بزرگوں اور ان جیسے دوسرے بزرگوں کی طرف منسوب کردیئے ہیں۔ یہ ان بزرگوں پر بہتان و افتراء ہے۔ یہ حضرات ان اقوال و آراء سے بالکل بری ہیں۔ اگر درحقیقت یہ ان حضرات کے اقوال ہوتے تو یقیناً یہ حضرات حجاج اور عبدالملک، پر ضرور نکیر کرتے۔ یہ مداہنت کرنے والے لوگ نہیں تھے۔ اور اگر

یہ حضرات نکیر کرتے تو یہ بات شہرت کے ساتھ منقول ہوتی - نیز یہ کہ اس کے اثرات ضرور ظاہر ہوتے اور اس کا رد عمل یقیناً واضح ہوتا حالانکہ تاریخ ان سب امور کے بارے میں بالکل ساکت ہے - جن ظالموں کو احادیث وضع کرکے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر افتراء کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ ہوئی وہ اگر حسن بصری و امام شعبی و امثالہم پر افتراء کریں اور ان کی طرف اپنے اقوال کاذبہ منسوب کردیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے ؟ اگر بطور فرض یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ ان بزرگوں نے واقعی جناب حجاجؒ رحمہ اللہ کی مذمت کی ہے اور انہیں ظالم کہا ہے تو بھی یہ لازم نہیں آتا کہ ہم ان کے اقوال مذکورہ کو صحیح سمجھ لیں - اجتماعی نفسیات کے اس اصول کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ علماء اور صوفیاء ' علمی ذوق اور علم میں انہماک رکھنے والے لوگ پروپیگنڈے سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں- یہ لوگ عوام سے بھی زیادہ اس معاملے میں کمزور ہوتے ہیں - وہ علماء صلحاء اس سے متاثر نہیں ہوتے یا کم متاثر ہوتے ہیں جو علمی مشغلہ کے ساتھ کچھ دنیاوی اور معاملاتی امور سے بھی تعلق رکھتے ہیں اس اصول کے پیش نظر اگر مذکورہ بالا بزرگوں نے سبائیوں کے جھوٹے پروپیگنڈے سے متاثر ہوکر اس قسم کی باتیں کہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں - لیکن ان کے اقوال کو سند نہیں بنایا جاسکتا بلکہ اسے ان کی نادانستہ غلط بیانی کہا جائے گا - جھوٹ تو جھوٹ ہی رہے گا - خواہ دانستہ بولا جائے یا نادانستہ - ان کے ان اقوال کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا - خصوصاً جبکہ دوسرے جلیل القدر علماء حجاجؒ مرحوم کی تعریف کررہے ہوں - جیسا کہ ہم آئندہ بیان کریں گے - یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں بقول مخالفین بنی امیہ یہ مذموم واقعات پیش آئے تھے ' اس میں صحابہ کرامؓ معتدبہ تعداد میں موجود تھے - حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ایسے جلیل القدر اور امتیازی شان رکھنے والے صحابیؓ تو حجاجؒ کے ساتھ مکہ معظمہ ہی میں موجود تھے - اور حجاجؒ ایک حیثیت سے ان کے تابع بھی تھے - ان کے علاوہ حضرت ابو ثعلبہؓ بن جرہم خشنی ' متوفی ۷۵ ھ دمشق میں مقیم تھے جو اموی خلافت کا پایہ تخت تھا - یہ بزرگ بیعت رضوان میں شریک تھے - حضرت سوید بن غفلتہ متوفی ۸۰ ھ کوفہ میں قیام پذیر تھے - حضرت جابر بن عبداللہ انصاری شریک بیعت عقبہ تھے - مدینہ منورہ میں رہتے تھے - ۷۸ ھ میں وفات پائی - رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ یہ چند اسماء گرامی بطور مثال پیش کردیئے گئے - ورنہ اس زمانہ میں جو صحابہؓ کرام موجود تھے ان کی تعداد اس سے زائد ہے - صحابہ کرامؓ کا ایک وصف جمیل قرآن مجید میں یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ وہ " امر بالمعروف و نہی

عن المنکر" کے خوگر ہیں۔ اگر دشمنان بنی امیہ کا یہ بیان صحیح ہے کہ حجاج و عبدالملک" بہت ظالم تھے۔ اور اموی خلافت سے عناد رکھنے والوں نے جو الزام ان پر لگائے ہیں ان میں ذرہ برابر بھی صداقت ہے تو ان صحابہ کرام نے ان پر کوئی نکیر کیوں نہ فرمائی؟ اگر نکیر فرمائی ہوتی تو یقیناً شہرت کے ساتھ منقول ہوتی۔ حالانکہ تاریخ میں اس قسم کی بات کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ اس سے روز روشن کی طرح روشن ہوجاتا ہے کہ شیعوں اور شیعیت نواز سنی نما لوگوں نے جو اعتراضات حجاج و عبدالملک" پر کئے ہیں۔ وہ بالکل غلط بے بنیاد' اور خالص جھوٹ ہیں۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے جو اوصاف حسنہ بیان فرمائے ہیں' ان کا ان حضرات میں پایا جانا قطعی اور یقینی ہے۔ اور ان حضرات کا کسی وقت بھی ان میں سے کسی وصف سے خالی اور محروم ہونا قطعاً غیر ممکن اور محال ہے۔ سنیت کے مدعی مخالفین خلافت بنی امیہ کی ذمہ داری ہے کہ اس سوال کا جواب دیں۔ لیکن میں پورے وثوق ویقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ قیامت تک اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔

تیسرا سوال بھی ایسا ہی ہے جس کا کوئی جواب بنی امیہ کے ان مخالفین کے پاس نہیں ہے اور وہ اس کا بھی کوئی معقول جواب نہیں دے سکتے۔ سوال یہ ہے کہ الصادق الامین سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد " خیر القرون قرنی " الحدیث کے کے بموجب خلیفتہ المسلمین عبدالملک اور حجاج مرحوم کا زمانہ قرن صحابہ ہونے کی بناء پر " خیر القرون" کے حدود میں داخل تھا۔ اگر ان معاندین و مخالفین خلافت امویہ کے زیر گفتگو بیانات صحیح اور مطابق واقع ہیں تو اس " قرن " کو " خیر القرون " میں کیسے داخل سمجھا جاسکتا ہے۔ ایک مومن کا فیصلہ یقیناً یہی ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سچی اور سراپا صدق ہے۔ یہ مؤرخین و معاندین یقیناً جھوٹے ہیں۔ اور حجاج و عبدالملک" کے اوپر جو الزام انہوں نے لگائے ہیں وہ سب غلط ہیں۔ اس حدیث شریف نے ان مسائل کا دوٹوک فیصلہ کردیا۔ کسی مسلمان کے بارے میں کوئی ایسی بات کہنا جو اس حدیث کے خلاف ہو قطعاً حرام اور تقاضائے ایمان کے خلاف ہے۔ اموی خلافت کے زوال کے بعد عبدالملک" اور حجاج کے بارے میں اموی و عباسی دور کے علماء ربانیین نے جس حسن ظن کا اظہار کیا ہے اور جس طرح ان کی تعریف کی ہے وہ انشاء اللہ چند صفحات کے بعد قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں گے۔

بحث کی طوالت ممکن ہے کہ بعض حضرات کو گراں گذرے۔ لیکن میرا عذر یہ ہے

کہ شیعوں اور شیعیت نوازوں نے اس دور کے بارے میں جھوٹے قصے کہانیوں' کو اس قدر شہرت دی ہے کہ حجاجؒ مرحوم کو ظالم کہنا' فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض ایسے مضامین نظر سے گذرے جو حجاجؒ اور عبدالملک کے کارناموں اور ان کے دینی خدمات کے تذکرے کے لئے لکھے گئے تھے۔ مگر ان میں بھی مضمون نگار نے حجاجؒ کے تذکرہ میں یہ لکھنا ضروری سمجھا "مگر وہ بہت ظالم تھا"۔ اس طرح اچھے اچھے صلحاء بھی بہتان طرازی کے گناہ میں سبائیوں اور سبائیت نوازوں کے ساتھ اشتراک و تعاون کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر حق پسند ہوں تو انشاء اللہ اس بحث کو پڑھنے سے ان کی اصلاح ہو جائے گی اور وہ اپنی غلطی سے توبہ کریں گے اور بہتان کے گناہ سے محفوظ رہیں گے۔ اس تطویل کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کے یہود اور مسیحی متشرقین اور اب بعض ہنود بھی اس دور کے مبینہ غلط قصوں کو پیش کرکے اس سے استدلال کرتے ہیں کہ معاذ اللہ "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت تقریباً بے اثر رہی۔ اور اسلام عملاً چند سال سے زیادہ قائم نہیں رہا"۔ اس بحث سے اس غلط اور بے بنیاد اعتراض کو بھی دفع کرنا منظور ہے۔

تیسرے یہ کہ ہماری درخشاں تاریخ پر جو سیاہی' سبائی منافقین اور یہود نے پھیری ہے اسے دیکھ کر اور حقیقت حال سے بے خبر رہ کر ہماری نئی نسل خصوصاً جو یورپ و امریکہ سے متاثر ہے' قومی خود حقارتی کے مہلک مرض میں مبتلا ہوجاتی ہے۔ اس کا سدباب اور اس مرض کا علاج مقصود ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ ہماری قوم میں ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو دین اسلام اور شریعت اسلامیہ کو بحالات موجودہ ناقابل عمل قرار دیتا ہے اور اس کی دلیل میں سبائیوں کے وضع کئے ہوئے ان جھوٹے قصوں کو پیش کرتا ہے جو خیر القرون کے ایک حصے میں بھی اسے ناقابل عمل ظاہر کرتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک قول:۔ "خیر القرون قرنی" الخ کو شیعہ اور ان کے معلم یہود معاذ اللہ غلط ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری اس بحث کا ایک اہم مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ بلاشبہ **الصادق الامین سید المرسلین علیہ افضل الصلوات و التسلیم** کا قول بالکل سچا' بلکہ سراپا صدق اور سچائی ہے۔ کذابوں کی ہرزہ سرائیوں سے حقائق نہیں بدل سکتے ان اکاذیب و بہتانات کو پیروں سے روند کر پھینک دو پھر دیکھو تو نبی کریم **علیہ افضل الصلوات والتسلیم** کے قول مذکور کی صداقت روز روشن کی طرح روشن نظر آئے گی۔

مسلمانوں کی ان دو جماعتوں کی اس کشمکش میں جسے علماء نے "فتنہ" کے لفظ سے تعبیر

کیا ہے' یہ واقعہ قابل توجہ ہے کہ کئی ماہ کی اس کشمکش میں فریقین نے حدود شرعیہ سے کبھی تجاوز نہیں کیا۔ حرم کی حرمت کا دونوں نے پورا پورا لحاظ کیا۔ کیا یہ کوئی معمولی بات ہے ؟ اس کی کوئی نظیر کوئی دوسری قوم پیش نہیں کر سکتی اگر کعبہ شریف پر سنگ باری یا آتش باری' یا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو مسجد حرام کے اندر قتل کرنے کی روایتوں میں سچائی کا شائبہ بھی ہوتا تو محاصرہ اتنے دن نہ جاری رہتا۔ بلکہ جب حضرت موصوف کے تقریباً دس ہزار رفقاء انہیں خیرباد کہہ چکے تھے اسی وقت آں محترم کو قتل کردیا جاتا۔ ان کا قتل کوئی مشکل کام نہیں رہا تھا۔ اگر تلوار سے نہیں تو تیروں سے کام لے کر انہیں قتل کیا جاسکتا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اور اسی وجہ سے نہیں ہوا کہ آں محترم کی طرح ان کے مخالفین بھی حدود شرعیہ سے تجاوز نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اور احترام حرم کی رعایت کرنا فرض سمجھتے تھے۔ نیز یہ کہ وہ حضرت ابن زبیرؓ کی جان کے دشمن نہیں تھے۔ ان کی آستیں حضرت ابن زبیرؓ کے خون سے پاک ہے۔ انہوں نے آں محترم کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ کسی شقی سبائی نے ان کے سر پر اینٹ مار کر انہیں شہید کیا تھا۔

اس بحث میں طوالت بیان کا چوتھا سبب زیادہ اہم اور قابل ذکر ہے۔ چند سال سے پاکستان میں یہ مسئلہ درپیش ہے کہ نفاذ شریعت کی کیا صورت اختیار کی جائے ؟ غالب اکثریت کی رائے ہے کہ فقہ حنفی کو قوانین کا ماخذ بنایا جائے۔ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ جملہ مکاتب فقہہ کو سامنے رکھ کر قانون سازی کی جائے۔ یہ سطریں ۱۴۱۰ھ ۱۹۹۰ء میں لکھ رہا ہوں۔ نفاذ شریعت کی منزل تو ابھی بہت دور نظر آتی ہے۔ یہ بحث بھی اب ختم ہوچکی ہے یا دب گئی ہے۔ مگر اس بحث کے دوران ہماری قوم یعنی اہل سنت ہی کے ایک معتدبہ گروہ نے برملا کہا اور لکھا کہ فقہ حنفی و مالکی وغیرہ جو مدون ہوئے ان میں ان ادوار کے حکمرانوں (خلفاء و امراء) کی ذاتی و سیاسی مصلحتوں کی رعایت کی گئی ہے اور احکام شرعیہ کو ان کے مصالحے کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لئے ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ ضرورت ہے کہ پاکستان کے علماء اور قانون داں مل کر نئے سرے سے اجتہاد کریں' اور کتاب و سنت سے قوانین کا استنباط کریں۔" یہ گروہ جسے اس وقت عرفاً دانش ور کہا جاتا ہے۔ وہ ہے جو انگریزی داں' اور موجودہ قانون کا ماہر' اس کے ساتھ عربی داں بھی ہے۔ اور فقہ اسلامی نیز تاریخ اسلام پر بھی وسیع نظر رکھتا ہے۔ فقہ اسلامی اور فقہاء اسلام کے متعلق ان کی مذکورہ بالا رائے تو بالکل غلط ہے۔' لیکن قابل توجہ چیز یہ ہے کہ وہ اس گمراہی میں مبتلا کیوں ہوئے ؟ اور ان کی رائے کا سبب کیا ہے ؟

سبب ظاہر ہے۔ ان کا یہ مرض مطالعہ تاریخ کا اثر ہے۔ سبائیوں نے جو جھوٹ، افتراء اور بہتانوں کے انبار ہماری تاریخ میں لگائے ہیں۔ ان کے سڑنے سے اس مہلک مرض کے جراثیم پیدا ہوئے جن سے ہماری قوم کا ایک اچھا خاصا طبقہ متاثر ہوا اور ہو رہا ہے۔

اس بحث کو طول دینے کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ وہ حضرات جو روافض اور رفض نواز لوگوں کی کورانہ تقلید میں یا اپنی ذاتی سیاسی یا غیر سیاسی غرض کے لئے، یا نسلی تعصب یا حسد کی بنا پر خلفاء بنی امیہ و بنی عباس، اور ان کے عمال و اعوان خصوصاً حجاج مرحوم کو ظالم و جابر کہنا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ ان کے محاسن کو چھپاتے ہیں۔ ان کی تعریف کرنا گناہ سمجھتے ہیں۔ جو شخص جھوٹے الزاموں سے ان کی برات ثابت کرتا ہے اسے خارجی کہنے لگتے ہیں ذرا سوچیں کہ وہ اسلام اور اہل اسلام کو کس قدر نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی سوچیں کہ قیامت کے دن اس کے بارے میں باز پرس کا بھی خطرہ ہے۔

خاتمہ بحث پر اس واقعہ کا اظہار کردینا بھی ضروری اور مفید ہے کہ شیعوں اور شیعہ نوازوں نے اس سلسلہ میں بکثرت روایتیں وضع کی تھیں۔ یہاں تک کہ حدیث کے نام سے بھی متعدد کہانیاں وضع کرلیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر افتراء پردازی کرتے ہوئے بھی انہیں اللہ تعالیٰ کا خوف نہ ہوا۔ ان روایتوں، اور نام نہاد حدیثوں میں سے بعض حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی ستائش اور بنو امیہ یا حجاجؒ کی مذمت میں ہیں۔ اور بعض خود حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی مذمت میں ہیں۔

اس قسم کے روایات اور نام نہاد احادیث میں سے بعض پر حافظ ابن کثیرؒ نے تنقید کی ہے اور ان کا باطل و موضوع ہونا ثابت کیا ہے۔ بعض کو بلا تبصرہ اس لئے ذکر کردیا ہے کہ ان کا موضوع، جعلی، اور غلط ہونا ان کے مضمون یا اسلوب بیان کی رکاکت کی وجہ سے ایسا ظاہر ہے کہ بیان کی حاجت نہیں۔ حاصل یہ کہ اس قسم کی سب روایتیں اور نام نہاد احادیث جو بنو امیہ یا حجاجؒ کی مذمت میں یا خلاف واقعہ حکایات، یا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی تنقیص پر مشتمل ہیں، قطعاً باطل موضوع اور جعلی ہیں۔ یہ سب شیعوں، اور شیعہ نواز مورخوں اور راویوں یا سبائیوں کے ایجنٹوں کے کارخانہ دروغ بافی میں ڈھالی ہوئی کہانیاں، اور افتراء پردازیاں ہیں جو سبائی فن تشہیر کا نمونہ ہیں۔ ان بے اصل جھوٹی روایتوں اور ان نام نہاد حدیثوں کا کوئی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔

تنبیہ:۔ عبدالملک اور حجاجؒ کے ساتھ لڑائی ہونے سے پہلے حضرت عبداللہ بن

زبیرؓ اور امیر یزیدؒ کے درمیان معرکہ آرائی ہو چکی تھی ۔ حضرت مسلم بن عقبہ رضی اللہ عنہ امیر یزیدؒ کی طرف سے اس فوج کے سپہ سالار تھے جو مکہ معظمہ کی طرف حضرت ابن زبیرؓ کے خلاف بھیجی گئی تھی ۔ شیعہ افواہ بازوں اور مورخوں نیز نسلی و خاندانی تعصب جاہلی کے مریضوں نے ان واقعات کے متعلق بھی پیٹ بھر کر جھوٹ بولا ہے ۔ سنگ باری آتش باری وغیرہ کے جھوٹے الزام امیر یزید مرحوم کے فرستادہ لشکر پر بھی لگائے ہیں ۔ ان کے متعلق بھی یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ بھی غلط اور سراپا کذب و بہتان الزام ہیں ۔ ہماری مذکورہ بالا بحث اور تحقیق ان کو بھی باطل اور غلط ثابت کرنے کے لئے کافی ہے ۔ جن کذابوں نے حجاجؒ مرحوم اور عبدالملک مرحوم اور ان کے لشکر پر بہتان باندھے ہیں انہیں نے امیر یزید مرحوم اور حضرت مسلم بن عقبہ رضی اللہ عنہ اور ان کے لشکر پر بھی بہتان باندھے ہیں اور ان سب پر جھوٹے اتہامات لگائے ہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حضرت مسلم بن عقبہؓ اور حضرت ابن زبیرؓ کے درمیان کوئی جنگ حرم مکہ کے اندر نہیں ہوئی ۔ انہوں نے بھی صرف محاصرہ کیا تھا ۔ دونوں فوجوں میں جو معمولی سی لڑائی ہوئی وہ حرم کے باہر ہوئی ۔ احترام حرم کا پاس و لحاظ فریقین کرتے رہے ۔ طبری وغیرہ تاریخوں میں جو سنگ باری وغیرہ کے قصے اس حادثہ کے متعلق ملتے ہیں وہ سب روافض اور رافضیت نوازوں کے گڑھے ہوئے ' بے اصل و بے بنیاد جھوٹے قصے ہیں ۔ ہماری بحث مذکور سے یہ حقیقت خوب روشن ہو جاتی ہے ۔ ذرا غور کی ضرورت ہے ۔

جنگ مذکور کے اسباب

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور دو اموی خلفاء کے درمیان معرکہ آرائی ہوئی اس کے اسباب کیا ہوئے ؟ اس کی تفصیل مورخ کا کام ہے ۔ "اظہار حقیقت" تاریخ کی کتاب نہیں ہے اس کا پہلا مقصد تو درحقیقت اصلاح عقائد ہے ۔ اس لئے ہم تفصیل کو نظر انداز کر کے صرف اس امر کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں جو اس خلفشار ' اور باہمی منازعت و تفرقہ کا حقیقی سبب بنا ۔ اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ اس سوء ظن کو دور کیا جائے جو مورخین کے غلط اور نامناسب اسلوب بیان اور سبائیوں کے وضع کئے ہوئے جھوٹے قصص و روایات کی وجہ سے متعلق افراد کے بارے میں پیدا ہوتا ہے ۔

پہلی بات کے متعلق ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ یہ دونوں لڑائیاں سراسر شیعوں اور شیعیت نوازوں کی ریشہ دوانیوں و سیسہ کاریوں ' اور فتنہ پردازیوں کا نتیجہ تھیں ۔ ورنہ دو فریقوں کا وجود ہی نہ ہوتا اور ان کے درمیان کسی جنگ کا تصور ہی نہ کیا جاسکتا ۔ اختصار

کے ساتھ اس کی توضیح یہ ہے کہ شیعوں نے جو تقیہ کرکے دمشق میں بھی جمع ہوگئے تھے۔
عبداللہ بن مطیع کو اپنا آلہ کار بنایا' انہوں نے نیز بعض دوسرے تقیہ باز سبائیوں اور
سبائیوں کے ایجنٹوں نے حضرت ابن زبیرؓ کو یہ باور کرادیا کہ امیر یزید فاسق و فاجر ہیں'
ملت ان سے بیزار ہے۔ صالحین قوم کسی ایسی اولوالعزم شخصیت کے خروج کے منتظر ہیں جو
اصلاح حال کے امیر یزید پر سختی کے ساتھ نکیر کرے۔ اگر وہ نہ مانیں تو بزور قوت انہیں
معزول کردے۔ نیز انہیں یہ باور کرایا کہ قوم کی نظریں آپ کی طرف ہیں۔ اور وہ آپ کو
خلیفتہ المسلمین بنانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ دوسری طرف امیر المومنین کے کان بھرتے
رہے اور انہیں یہ باور کرایا کہ حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ جاہ اقتدار کے طالب' خلافت کے
خواہاں اور آمادہ بغاوت ہیں۔ ان دونوں کو ورغلا کر ان سبائی منافقین نے دونوں کی فوجوں
کو آمنے سامنے صف آراء کردیا۔ امیر یزید کی خلافت کے زمانہ میں پورا عالم اسلامی ایک
مرکز پر مجتمع ہوگیا تھا۔ یہ چیز شیعوں اور یہود کے لئے سوہان روح تھی۔ امیر یزیدؒ کے تدبر
اور ان کی دانشمندی اور اعلیٰ صلاحیت حکمرانی (STATES MANSHIP) کا ایک
ثبوت یہ بھی ہے کہ امت میں خلفشار پیدا کرنے کی شیعی اور یہودی مساعی کے باوجود انہوں
نے امت کو ایک مرکز پر مجتمع رکھا۔ ان کے انتقال کے بعد روافض اور ان کے آلہ کار
رافضی نوازوں' نیز یہود کی ریشہ دوانیوں اور خفیہ و علانیہ دسیسہ کاریوں اور فساد انگیزیوں
کی وجہ سے عالم اسلامی میں سخت خلفشار' اور لا مرکزیت کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ حافظ ابن
کثیر لکھتے ہیں کہ "تین ماہ تک عالم اسلامی بغیر کسی امام اور خلیفہ کے رہا" (۱) اس لا
مرکزیت اور افراتفری کے عالم میں اہل حجاز نے حضرت ابن زبیرؓ سے بیعت کرلی اور شام
کے لوگوں نے حضرت مروان سے بیعت کرکے انہیں خلیفہ منتخب کرلیا۔ بیعت دونوں میں
سے کس سے پہلے کی گئی اور کس سے بعد کو؟ اس کا کوئی قطعی جواب نہیں مل سکا۔
سبائیوں نے فساد پیدا کرنے کے لئے اسے اور مبہم بنادیا۔

ان شیعہ مفسدین کے دو گروہ ہوگئے اور آپس میں صلاح و مشورہ کرکے دونوں طرف
پہنچ گئے۔ ایک گروہ نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو باور کرادیا کہ ان کی بیعت پہلی ہے۔
اس لئے حضرت مروانؓ اور ان کے جانشین عبدالملکؒ باغی ہیں اور حفاظت خلافت کے
لئے ان سے قتال و جدال کرنا واجب ہے۔
دوسری طرف دوسرے گروہ نے حضرت مروانؓ' اور عبدالملکؒ کو اسی طرح اولیت کا

(۱) البدایہ و النہایہ ج ۸ ص ۲۳۹

یقین دلا کر بغاوت فرو کرنے اور اس کے لئے جنگ کرنے پر آمادہ کیا۔ اس طرح یہ مفسد منافقین ان صالح مسلمانوں کے دو ایسے گروہوں کو میدان جنگ میں ایک دوسرے کے مقابل لے آئے جو اپنے مسلمان بھائیوں سے قطعاً جنگ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے متعلق یہ سوء ظن کرنا کہ انہوں نے جاہ و اقتدار حاصل کرنے کے لئے جنگ کی سخت غلطی ہے۔ آں محترم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔ وہ اس ورطہ میں مبتلا نہیں ہوسکتے تھے۔ اگر وقتی طور پر ان کے دل میں یہ جذبہ پیدا بھی ہوتا تو اس کی بقاء غیر ممکن تھی کیونکہ پوری جماعت صحابہؓ کا ایک خاص وصف جمیل قرآن مجید میں یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ

وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ (آل عمران: ۱۳۵)

"وہ اپنی غلطی پر اصرار نہیں کرتے درآں حالیکہ وہ جانتے ہوں"

صحابہ کرام معصوم نہیں تھے۔ معصیت کا صدور ان سے بھی ممکن تھا، مگر کسی معصیت کا عادی ہوجانا، یا اسے بار بار دہرانا، ان کے لئے غیر ممکن تھا۔ جنگ و جدل کا سلسلہ خاصی مدت تک جاری رہا۔ اگر اس کا محرک جذبہ حب جاہ و اقتدار ہوتا تو اتنے دن اس کی بقاء کا شمار "اصرار علی المعصیۃ" میں ہوتا۔ جس کا صدور ان سے ازروئے قرآن کریم غیر ممکن اور محال تھا۔ اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ وہ مخلص تھے۔ اور انہوں نے اپنے اجتہاد کے بموجب اتباع شریعت ہی کے لئے جنگ کی۔

ان کے مقابلہ میں عبدالملک" تھے۔ وہ اگرچہ صحابی نہیں ہیں مگر ان کی پوزیشن بھی ازروئے شریعت اور دستور اسلامی مستحکم تھی۔ انہوں نے بھی اپنے اجتہاد کے بموجب خلوص کے ساتھ اتباع شریعت ہی کے لئے جنگ کی۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم انہیں حب جاہ و اقتدار کا مریض قرار دیں۔ وہ صحابی نہیں ہیں۔ اس لئے ان سے اس کی قطعی نفی کی تو کوئی دلیل شرعی ہمارے پاس نہیں۔ لیکن ازروئے شریعت اسلامیہ و دستور اسلامی ان کا موقف بھی مستحکم تھا۔ اور جس طرح حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے لئے حفاظت خلافت اور بغاوت ختم کرنے کے لئے قتال و جدال شرعاً جائز تھا۔ اسی طرح ان کے لئے بھی جائز تھا۔ دونوں کے اجتہادوں میں سے کس کا اجتہاد صحیح تھا؟ اس کا کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ اور اب اس کا فیصلہ کرنے کی کوشش کرنا بے سود ہے۔ جب تک کوئی دلیل نہ ہو اس وقت تک ان کی نیت پر بھی شبہ کرنا جائز نہیں۔ انہیں بھی مخلص ہی کہا جائے گا۔ اختلاف اجتہاد کی وجہ سے جدال و قتال ہوجانا۔ کوئی عیب نہیں کہا جاسکتا۔ یہ طاعت ہی تھی معصیت

نہیں تھی ۔ اپنے اخلاص کی وجہ سے ابن زبیرؓ مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے ۔

حضرت مروان ' اور حضرت مسلم بن عقبہ رضی اللہ عنہما کے متعلق بھی یہی تقریر کافی ہے ۔ یہ حضرات بھی مخلص تھے اور اپنے مخلصانہ عمل میں ماجور ہوئے ۔ فریق مقابل کے مقابلے میں یہ حضرات دلیل شرعی کی بناء پر خود کو حق پر سمجھتے تھے ۔ اور فریق مقابل کو اسی دلیل کی بناء پر برسر باطل جانتے تھے ۔ حقیقت واقعہ کے لحاظ سے ان کی رائے صحیح تھی یا غلط ؟ اس سے بحث نہیں اللہ تعالیٰ کے یہاں معاملہ ان کی نیت کی بناء پر ہوگا ۔ اپنی دانست میں انہوں نے حکم شرعی پر عمل کیا ۔ اس لئے وہ گناہ گار نہیں ہوئے ۔ بلکہ ماجور ہوئے ۔حرم شریف میں سنگ باری اور اس کے دوسرے متعلقات کی بحث تو ختم ہوئی ۔ اس کے ساتھ خلافت عادلہ امویہ کے اوپر مخالفین کے بہت سے اعتراضات کی غلطی بھی ثابت ہوگئی ۔ یہ اعتراضات و الزام مخالفین بنی امیہ کے لئے مایہ ناز ہیں ۔ لیکن اس کتاب کا مطالعہ کرنے والوں نے دیکھ لیا کہ یہ صحت و حقیقت سے کس قدر دور ہیں ۔ اور صرف بغض و عناد اور حسد سے پیدا ہوتے ہیں ۔ ان کی کوئی مستحکم اصل و بنیاد نہیں ۔ اسی بحث کو سامنے رکھ کر ان لوگوں کے دوسرے غلط اعتراضات پر بھی نظر کرنا چاہئے ۔ انشاء اللہ ان کی غلطی بھی آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجائے گی ۔ اس کے پیش نظر ہم اس بحث کو بالکل ختم کردیتے لیکن سبائی دروغ بافی ' مغالطہ دہی اور سوء تعبیر کی ایک عجیب مثال پیش کئے بغیر اس بحث سے قلم روکنے کو جی نہیں چاہتا ۔ یہ مثال ایسی ہے جس میں سبائی آرٹ خوب نمایاں ہے ۔ مگر باوجود اس کے بڑے بڑے محققین اور فضلاء اس دام فریب میں گرفتار نظر آتے ہیں ۔ اسی پہلو کے پیش نظر ہم نے اسے عجیب مثال کہا ہے ۔ مخالفین خلفاء بنی امیہ کا مشہور اعتراض ہے کہ " بعض اموی افراد نے جو خلیفۃ المسلمین ہشام رحمہ اللہ سے قرابت رکھتے تھے بعض ذمیوں کی زمینیں غصب کرلی تھیں ۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے تو ان اہل ذمہ نے موصوف سے فریاد کی ۔ اور موصوف ایک دن خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے تو خطبہ سے فراغت سے قبل ان سب زمینوں کے متعلق اہل ذمہ کے حق میں فیصلہ کردیا ۔ اور بنی امیہ کے ان افراد کو جو ان کی نظر میں غاصب و ظالم ٹھہرے تھے ' اراضی مذکور مالکان کو واپس کرنے کا حکم دیدیا " ۔ دشمنان خلافت بنی امیہ اس قصے کو عمر بن عبدالعزیزؒ کی منقبت اور بنو امیہ کے منقصت یعنی ان کے ظلم و جور کو ثابت کرنے کے لئے بیان کیا کرتے ہیں ۔

اصل واقعہ

مندرجہ بالا قصہ سبائی فن دروغ گوئی اور مسخ حقائق کا ایک شاہکار ہے۔ پورا قصہ بالکل غلط اور کذب خالص ہے۔ اصل واقعہ کی تعبیر اپنے طبع زاد عنوان و اسلوب سے کرکے بنی امیہ پر بہتان طرازی کی گئی ہے۔ اصل واقعہ کیا تھا؟ اسے معلوم کرنے کے لئے بطور تمہید ایک مسئلہ شرعی کی مختصر وضاحت کرنا پڑے گی۔ جو درج ذیل ہے:۔

جب کوئی ملک فتح ہوکر اسلامی مملکت میں داخل ہوتا ہے تو اس کی پوری زمین مملکت (STATE) کی ملکیت میں داخل ہوجاتی ہے۔ پھر اسلامی حکومت اسے مملکت کے باشندوں کو تقسیم کرتی ہے۔ اسلامی حکومت جو قطعہ اراضی کسی شخص کو بطور تملیک دیدے تو وہ اس کی ذاتی ملک میں داخل ہوجاتا ہے۔ مفتوحہ زمیں میں "اوفتادہ" زمین بھی ہوتی ہے۔ جو غیر آباد ہوتی ہے۔ ایسی زمین کو فقہ کی اصطلاح میں "ارض موات" کہتے ہیں۔ جس کا لفظی ترجمہ "مردہ زمین" کیا جاسکتا ہے۔ انہیں "موات" (مردہ)۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاتا۔ اور یہ خالی پڑی ہوتی ہیں۔ حکومت اسلامیہ ایسی زمینوں کو "احیاء" یعنی انہیں آباد کرنا چاہتی ہے تو اس کے قطعات کرکے اس کے طلب گاروں کو آباد کرنے کے لئے تقسیم کردیتی ہے۔ آباد کرنے کا یہاں وسیع تر معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس پر مکان وغیرہ تعمیر کرنا' باغ لگانا کاشت کرنا یہ سب چیزیں آباد کرنے میں داخل ہیں۔ محل وقوع اور دوسرے امور کے اعتبار سے آباد کاری کا جو طریقہ مناسب ہو وہی اختیار کرنا ہوگا۔ اور حکومت کو اس کے متعین کرنے کا بھی اختیار ہے۔

مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر زمین لینے والا ایک مدت مقررہ کے اندر اس قطعہ زمین کو آباد نہ کرے تو حکومت کو اختیار ہے کہ اس سے وہ زمین واپس لے لے اور کسی دوسرے کو دیدے جو اس کا "احیاء" (آباد کاری) کرکے اس سے فائدہ اٹھائے۔ یہ طریقہ تقریباً ویسا ہی ہے جیسے کراچی میں کے۔ ڈی۔ اے۔ اور لکھنؤ میں امپروومنٹ ٹرسٹ کی طرف سے پلاٹ الاٹ کئے جاتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد مذکورہ بالا واقعہ کی حقیقت پر نظر کیجئے۔ یہ درحقیقت صرف "احیاء موات" کا معاملہ تھا۔ "غصب" اور "ظلم" سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ بعض اموی حضرات نے حکومت سے "ارض موات" کے کچھ قطعات حاصل کئے' مگر یہ مدت معین کے اندر انہیں آباد نہ کرسکے۔ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؒ جب خلیفہ ہوئے تو کچھ ذمی

ان زمینوں کے طالب ہوئے ۔ جنہوں نے ان کے " احیاء " (آباد کرنے) کا ارادہ ظاہر کیا ہوگا ۔ اموی خاندان کے نام جو ان کا الاٹمنٹ ہوا تھا اس میں بقاء ملک کے لئے ایک مدت معینہ کے اندر " احیاء " کی شرط تھی ۔ وہ شرط نہیں پوری ہوئی ۔ اس لئے امیر المومنین موصوف نے زمینیں امویوں سے واپس لے لیں اور ان اہل ذمہ کے نام الاٹ کردیں ۔ وہ زمینیں ان اہل ذمہ کی ملکیت نہیں تھیں ۔ اور نہ کبھی ان کے قبضے میں رہی تھیں ۔ وہ سب حکومت کی تھیں ۔ حکومت نے ایک سے واپس لے کر دوسرے کو عطا کردیں ۔ اس میں نہ کوئی غصب تھا اور نہ کوئی ظلم ہوا ۔ اسے " غصب " اور " ظلم " کہنا الزام تراشی اور بہتان طرازی کی بہت ہی مکروہ مثال ہے ۔ آج بھی بکثرت ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ شہر یا دیہات میں لوگ حکومت سے زمین پٹے پر لیتے ہیں ۔ اور اگر وہ ایک مقررہ مدت کے اندر آباد نہیں کرتے تو حکومت ان سے زمین واپس لے کر کسی دوسرے شخص کو الاٹ کردیتی ہے جو اس کا طالب ہوتا ہے ۔ کوئی سمجھ دار آدمی اسے غصب اور ظلم کا معاملہ نہیں سمجھتا اور نہ سمجھ سکتا ہے ۔ پھر زیر بحث معاملے میں بنی امیہ کو غصب اور ظلم کا مرتکب کیوں قرار دیا جاتا ہے ؟

یہ بات کہ یہ معاملہ صرف " احیاء موات " کا تھا غصب اور ظلم کا اس میں شائبہ بھی نہیں تھا مبینہ واقعہ میں معمولی غور کرنے سے واضح ہوجاتی ہے ۔ اگر اسے غصب اور ظلم کا معاملہ کہا جائے ' تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے صرف مستغیث اور مدعی کا دعویٰ سن کر مدعی علیہم کا بیان اور جواب دعویٰ سنے بغیر مدعی کے حق میں فیصلہ کیسے کردیا ؟ یہ تو شرعاً وعقلاً ہر طرح ناجائز اور اصول عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے ۔ مدعی سچا تھا یا جھوٹا لیکن عمر عبدالعزیزؒ کی اس کاروائی کو تو شرعاً وعقلاً ظلم اور نا انصافی ہی کہا جائے گا ۔ صحیح اور عادلانہ طریقہ تو یہ تھا کہ موصوف مدعیان کا دعویٰ سننے کے بعد مدعا علیہم کو بلا کر ان کا جواب دعویٰ طلب کرتے ۔ اگر وہ غصب کا اقرار کرتے اور مدعیان کا دعویٰ تسلیم کرلیتے تو زمین ان کے قبضہ سے نکال کر مدعی کو دیدیتے ۔ لیکن اگر وہ انکار کرتے تو مدعیان سے ان کے دعوے پر " بینہ " (ثبوت) طلب کرتے ۔ بصورت ثبوت ان کے حق میں فیصلہ کرتے ۔ عدم ثبوت کی صورت میں مدعا علیہم سے قسم لیتے ۔ اگر وہ قسم نہ کھاتے تو مدعی کے حق میں فیصلہ ہوتا ۔ بصورت قسم ان کے حق میں فیصلہ کرتے اور ان کا قبضہ برقرار رکھتے ۔ اسلامی عدالت کا یہی طریقہ کار (PROCIDURE) ہے ۔ بلکہ اب تو دنیا کی ہر عدالت میں یہی طریق اختیار کیا جاتا ہے ۔ اور اسے لازم سمجھا جاتا ہے ۔

اگر ہم زیر بحث معاملے کو غصب اور ظلم کا مقدمہ اور مناقشہ کہتے ہیں تو ہمیں ان ذمیوں کے بجائے بنی امیہ کے افراد مشار الیہم کو مظلوم اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو ظالم اور آداب و ضوابط قضاء و عدل سے ناواقف کہنا پڑے گا۔ ہم حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو نہ تو ظالم و جابر کہہ سکتے ہیں۔ اور نہ طریق عدل و قضاء سے جاہل' باعتبار علم و فہم و تقویٰ ان کی عظمت تسلیم شدہ واقعہ ہے۔ اس لئے ہم اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہیں۔ کہ مخالفین بنی امیہ مورخین و علماء کا یہ بیان کہ زیر بحث واقعہ غصب کا معاملہ تھا بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے جسے صداقت سے ذرہ برابر بھی تعلق نہیں۔ پھر جب یہ غصب کا معاملہ نہیں تھا تو اسے "احیاء موات" ہی کا معاملہ سمجھنا پڑے گا۔ کیونکہ اس کے سوا کوئی تیسری صورت معاملہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ایسا کوئی معاملہ جس میں "خصومت" ہوسکے اور حق تلفی و حق طلبی کا مسئلہ درپیش ہو فرض کرنے سے وہی محذور لازم آتا ہے جس کا تذکرہ ابھی ہوچکا ہے اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ اس واقعہ کا تعلق' "احیاء موات" سے سمجھا جائے۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ اسے غصب اور ظلم کہنا بنی امیہ پر بہتان اور ظلم ہے۔

خلافتِ امویہ کی اسلامیت کے بارے میں
جمہور متقدمین علماء کرام و فقہاء عظام کی شہادت

تیسری صدی ہجری' یا اس سے پہلے جو علماء دین رہبر و رہنما رہے ہیں وہ بالاتفاق بنوامیہ کے دور خلافت کو اسلامی دور ان کے نظام کو اسلامی نظام' اور ان خلفاء نیز ان کے عمال کو ثقہ' عادل' فقیہ' و متقی سمجھتے تھے۔ ان کی یہ رائے جو ان کے مشاہدے یا خبر متواتر پر مبنی تھی۔ ان کے عمل سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور تواتر التزامی کے ساتھ ہم تک پہنچی ہے۔ اس لئے ہم اموی دور خلافت کو مبارک' درخشاں' اسلامی' عادلانہ اور اسلامی نظام حکومت کا قابل تقلید نمونہ سمجھنے اور اس کا یقین رکھنے میں حق بجانب ہیں۔ اسی طرح ہم یہ سمجھنے میں بھی حق بجانب ہیں کہ شیعی اور شیعیت نواز مورخین' یا نسلی و خاندانی تعصب جاہلی کے مریض' سنی تاریخ نگاروں نے ان خلفاء' صالحین اور ان کے مبارک ادوار کے خلاف جو کچھ لکھا ہے' اور ان کی توہین و تنقیص کے لئے جو روایتیں بیان کی ہیں وہ حقیقت سے دور' خلاف واقعہ' من گھڑت اور دروغ محض ہیں' وہ

درحقیقت شیعوں نیز خاندانی تعصب کے مریض سنی نما شیعوں اور یہود کی وضع کی ہوئی کہانیاں ہیں جن کی کوئی اصل نہیں۔

علماء متقدمین کی اس پاکیزہ رائے کو علماء متاخرین بھی برابر صحیح تسلیم کرتے چلے آرہے ہیں اور آج تک تسلیم کی جاتی ہے۔

جمہور اہلسنت کو جو اپنی تاریخ کی خوبی' رفعت' اور تابناکی' کا یقین اور اس پر فخر ہے جو تواتر نفسی کے طریقہ سے چودہ سو برس سے ہر قرن میں منتقل ہوتا ہوا' دور موجودہ تک پہنچا ہے۔ جس کا تفصیلی تذکرہ ہم چند صفحات پیشتر کر چکے ہیں۔ اس کا ایک سبب علماء عظام کی مذکورہ بالا رائے بھی ہے۔ جس سے عام مسلمان بھی بے خبر نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ تواتر التزامی کے طریقے سے بواسطہ خواص ان تک پہنچی ہے۔

اموی دور خلافت کی ابتداء امیر المومنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت سے سمجھی جاتی ہے۔ ان کے عہد خلافت سے دمشق کی اموی خلافت کے خاتمہ تک جو نظام حکومت رہا' اور خلفاء اور ان کے قضاۃ و عمال نے جو فیصلے کئے یا فتوے دیئے' اور نئے پیش آنے والے مسائل کے جو شرعی حل نکالے ان کو متقدمین فقہاء ملت و حکماء امت نے اہم اور وزنی قرار دیا ہے۔ اور ان سے حسب موقع مستشهد کر کے انہیں فقہی و قانونی نظائر اور فتاویٰ کا درجہ دیا ہے۔ اسی طرح خلفاء کے ادوار حکومت کے تعامل کو بھی دلیل اور حکم شرعی کی معرفت کا ایک ذریعہ قرار دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ انہیں کے مطابق فتویٰ دیا۔ اور حکومت عباسیہ کو ان قوانین و ضوابط کو جاری و نافذ رکھنے کا مشورہ دیا ہے۔

اموی عہد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت معاویہؓ صحابی ہیں۔ اس لئے ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے قول و عمل سے فقہاء و علماء نے بکثرت استدلال و استناد کیا ہے۔ خصوصاً فقہاء احناف نے مثلاً امام محمد صاحب رحمہ اللہ اپنی کتاب "السیرالکبیر" میں یہ مسئلہ بیان کرتے ہیں کہ اگر بیت المال میں اخراجات جہاد کی گنجائش نہ ہو تو اخراجات جہاد و دفاع کے لئے مسلمانوں پر مزید ٹیکس لگانا جائز ہے۔ اور دلیل میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا عمل پیش کرتے ہیں کہ آں محترم نے اپنے زمانہ خلافت میں ٹیکس لگایا تھا۔ شرعی نقطہ نظر سے مسلمانوں پر ٹیکس لگانے کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ مگر اس ٹیکس کے جواز کے لئے امام محمدؒ حضرت معاویہؓ کے عمل سے استدلال کافی سمجھتے ہیں۔ کتب فقہ اور شروح حدیث میں ان کے قول و عمل سے

استدلال کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں ۔ ایک مسئلہ کا تذکرہ ہم نے بطور مثال کردیا ۔ ورنہ ان کے دور خلافت کے مبارک و مستحسن ہونے میں کسی کلام کی گنجائش نہیں ۔ کیونکہ وہ صحابی اور خلیفہ راشد ہیں ۔ اور صحابہ کی عدالت وثقاہت اور ان کا راشد و ہدایت یافتہ ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے ۔ اور ان کا مقبول عنداللہ ہونا قطعی اور یقینی ہے۔ آئندہ صفحات میں ہم ان کے بعد کے ادوار خلافت اسلامیہ کے متعلق علماء کرام ' و فقہاء ومحدثین عظام کے طرز عمل کو سامنے لائیں گے۔

امام یوسف رحمہ اللہ کی جلالت شان کے متعلق کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ۔ اپنی مشہور تصنیف "کتاب الخراج" میں مفتوحہ ممالک میں کفار محاربین کی متروکہ آراضی کے بارے میں امیر المومنین ہارون الرشید رحمہ اللہ کے ایک سوال کا جواب دینے کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"فہذا سبیل القطائع عندی فی ارض العراق والذی صنع الحجاج ثم فعل عمر بن عبد العزیز فان عمر رضی اللہ عنہ اخذ بذلک بالسنۃ فان من اقطعہ الولاۃ المھدیون فلیس لاحد ان یرد ذلک" (۱)

"پس ارض عراق میں زمینداریوں کے بارے میں میرے نزدیک یہ حکم ہے اور یہ وہی ہے جو حجاج نے کیا تھا پھر عمر بن عبدالعزیز نے بھی وہی کیا ۔ بیشک عمر بن عبدالعزیز نے (اللہ ان سے راضی ہو) سنت کے مطابق عمل کیا ۔ کیونکہ جب کسی کو (کوئی قطعہ زمین) ہدایت یافتہ والی عطا کردے تو کسی کے لئے اسے واپس لینا جائز نہیں۔"

امام یوسف" ' حجاج" کے عمل سے استدلال فرمارہے ہیں ۔ کیا کسی ظالم و جابر کے عمل کو بطور نظیر پیش کرکے اس کی پیروی کی تلقین کی جاسکتی ہے ؟ پھر بتاتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز نے حجاج کے عمل کی پیروی کی اور " اقطاع " کے بارے میں ان کے حکم و فیصلے کو برقرار رکھا اور خود بھی وہی حکم دیا یہی نہیں بلکہ حجاج اور دوسرے اموی عمال وولاۃ کو "مہدی "
یعنی ہدایت یافتہ کہتے ہیں ۔ گویا ان کے عام طرز عمل کی تحسین و تقویت اور اس کے مطابق شریعت ہونے کی تصدیق و توثیق کرکے اسی کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں نیز امیر المومنین ہارون الرشید" کو ان کی اتباع کی تلقین کرتے ہیں ۔

---

(۱) کتاب الخراج فصل فی ذکر القطائع ص ۶۳

خلافت بنی امیہ کے متعلق امام ابو یوسفؒ کی یہ رائے تنہا ان کی رائے نہ تھی۔ بلکہ اس دور میں جملہ فقہاء و محدثین و علماء اعلام کی رائے تھی، جس کی دلیل یہ ہے کہ ان کے فتوے پر امیرالمومنین ہارون الرشیدؒ نے عمل کیا، اور کسی عالم دین نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ یہ فتویٰ فقہ اسلامی کا جزو بن گیا۔ اور کتب فقہ کے ہزاروں نسخوں میں مندرج ہوا، علماء ہر زمانہ میں اسے پڑھتے پڑھاتے رہے، اور آج بھی ان مسائل کی تعلیم جاری ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خلافت بنی امیہ کی مذکورہ بالا تحسین و ستائش جمہور علماء اہلسنّت کی رائے ہے جو تواتر کے ساتھ منقول ہے اور جس کی ابتداء مشاہدے سے ہوئی۔ فقہ حنفی کی تدوین، عہد بنی امیہ میں ہوئی تھی۔ امام ابو یوسفؒ اسی دور میں امام فقہ بنے تھے۔ خلافت اسلامیہ کے اس تابندہ دور کا خود انہوں نے مشاہدہ کیا تھا۔ اس لئے وہ "کتاب الخراج" میں جو مالیات، و انتظامیات ودستور وغیرہ کے مسائل بیان کرتے ہیں اور جو فتوے دیئے ہیں، ان میں عہد بنی امیہ کے تعامل کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اور جہاں ضرورت ہوئی ہے وہاں صراحت کے ساتھ اس کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال اوپر گزری دوسری مثال ملاحظہ ہو:۔

امام ابو یوسفؒ یہ مسئلہ بیان فرماتے ہیں کہ اگر اہل کتاب سے شرائط صلح میں یہ بات طے پائی ہو کہ ان کے گرجا، اور بیعے باقی رہیں گے۔ تو قبضہ کے بعد انہیں منہدم کرنا جائز نہیں۔ اس فتوے پر عہد خلافت بنی امیہ کے ایک واقعہ، اور اس پر اس دور کے علماء کے فتوے، اور اس فتوے پر اموی حکومت کے عمل سے استدلال کرتے ہیں:۔

"وقد کان نظر فی ذلک غیر واحد من الخلفاء الماضین وھموا بھدم البیع والکنائس التی فی المدن والامصار فاخرج اھل المدن الکتب التی جری الصلح فیھا بین المسلمین وبینھم ورد علیھم الفقھاء والتابعون ذلک وعابوہ علیھم فکفوہ عما ارادوا من ذلک" (۱)	"ایک سے زیادہ گزشتہ خلفاء نے اس مسئلے پر نظر ثانی کی تھی اور شہروں اور بستیوں میں تعمیر شدہ بیعوں (یہود کی عبادت گاہیں) اور کنیسوں (گرجے) کو منہدم کرنے کا ارادہ کیا۔ تو ان شہر والوں (یہود اور مسیحیوں) نے وہ مکتوبات نکال کر دکھائے جن میں وہ صلح نامہ درج تھا، جو ان کے اور مسلمانوں کے درمیان ہوا تھا اور فقہاء و تابعین نے (ان خلفاء کو عمارات مذکورہ منہدم

(۱) کتاب الخراج زیر عنوان "فصل فی البیع والکنائس"، ص ۱۵۹۔

کرنے سے) منع کیا اور اسے معیوب قرار دیا
پس (یہ خلفاء) اپنے اس ارادے سے باز
آئے ۔ (یعنی ان عمارات کو منہدم کرنے
سے باز آگئے)"

یہود و نصاریٰ اپنی ان عبادت گاہوں کو اسلام اور خلافت اسلامیہ کے خلاف سازشوں کے لئے استعمال کرتے تھے۔ انہیں عمارتوں میں بیٹھ کر شیعہ اسلام و خلافت اسلامیہ کو نقصان پہنچانے کے لئے یہود و نصاریٰ سے گٹھ جوڑ کرکے اپنے ناپاک منصوبے بناتے تھے۔ ان مفاسد پر نظر کرکے ان خلفاء اسلام نے انہیں منہدم کرنے کا ارادہ فرمایا ہوگا۔ (۱) مگر چونکہ یہ معاہدے کی خلاف ورزی تھی اس لئے فقہاء نے اس سے روکا۔ اور یہ حضرات خلفاء باوجودیکہ خود فقہاء مجتہدین تھے، مگر انہوں نے جمہور علماء کی اتباع کی اور اپنا ارادہ ترک کردیا۔ یہ ان کے متقی خدا ترس، اور متبع شریعت ہونے کی ایک روشن دلیل ہے۔

دوسری طرف اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے علماء دین اپنے فریضہ احتساب حکومت سے غافل نہیں رہتے تھے۔ اور حسبۃً اسے انجام دیتے رہتے تھے۔ نیز اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلفاء بنی امیہ اور ان کے عمال رحمھم اللہ کی نظر میں علماء دین و فقہاء ملت کی کیسی عظمت وقعت تھی۔ اور حکومت و عوام مسلمین پر علماء دین کا کتنا اثر تھا۔

خلفاء بنی امیہ اور ان کے عمال و معاونین کے متعلق امام ابو یوسف" کی جو تحسین آفرین رائے ظاہر ہورہی ہے وہ تنہا ان کی رائے نہیں ہے بلکہ ان دور بلکہ ان سے پہلے کے ادوار کے جملہ علماء و فقہاء کی رائے تھی، جس کی وضاحت ہم کرچکے ہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ کے علم و فضل اور ورع و تقویٰ کی رفعت و عظمت معروف و مشہور ہے۔ ان کی کتاب موطا کی مندرجہ ذیل سطریں ملاحظہ ہوں:۔

"حدثنی مالک عن ابن شھاب ان عبد الملک بن مروان قضی فی امراۃ اصیبت مستکرھۃ بصداقتھا علی من فعل ذلک بھا"۔

" امام مالک" ابن شہاب سے روایت کرتے ہیں کہ (امیر المومنین) عبدالملک نے ایک عورت کے بارے میں جس سے زنا بالجبر کیا گیا تھا، یہ فیصلہ کیا تھا کہ جس نے جبرا اس کی

---

(۱) اگر بالفرض یہ مفاسد نہیں تھے تو بھی کوئی نہ کوئی مقصد تو ہوگا۔ مگر حکم شریعت کے مقابلے میں یہ صالح اور متقی خلفاء اس سے دستبردار ہوگئے۔

عصمت دری کی ہے، وہ اس کا مہر ادا کرے۔"(۱)

ملاحظہ ہو۔ امام مالکؒ کے ایسے جلیل القدر امام مجتہد اور فقیہ نبیب امیر المومنین عبدالملکؒ اموی کے فیصلے کو نظیر کا درجہ دے رہے ہیں۔ اور اسی کے مطابق فتوے دیتے ہیں۔ موطا میں امیر المومنین عبدالملکؒ کے فیصلے سے کتاب المکاتب اور کتاب العقول میں بھی استدلال کیا گیا ہے۔ اس سے عیاں ہے کہ امام مالکؒ خلیفۃ المسلمین عبدالملکؒ سے کس قدر حسن ظن رکھتے تھے۔ اگر انہیں خلیفہ عادل فقیہ مجتہد، متقی متورع نہ سمجھتے تو ان کے فیصلے سے استدلال کیسے کرتے؟ کیا کسی ظالم کے فیصلے اور فتوے کو بھی دلیل بنایا جا سکتا ہے؟

امام قاضی ابو عبید قاسم بن سلام البغدادی الفقیہ (متوفی ۲۲۴ھ) مشہور فقیہ و محدث ہیں۔ ایک مدت تک منصب قضاء پر فائز رہے۔ اسحاق بن راھویہ رحمہ اللہ نے ان کے متعلق کہا ہے کہ "وہ مجھ سے زیادہ فقیہ ہیں" اپنی مشہور کتاب "الاموال" میں لکھتے ہیں:-

"حدثنی نعیم بن حماد عن ضمرۃ بن ربیعۃ عن رجاء بن ابی سلمۃ ان فلانا ذکر رجلا من خلفاء بنی امیۃ اقطع سعید بن عبد الملک نہرہ الذی علی الفرات، وکان غیضۃ فیہا سباع فاعطاہا ایاہ فعمرہا، فھی نہر سعید" (۲)

"مجھ سے نعیم بن حماد نے ضمرہ بن ربیعہ کے واسطے سے رجاء بن ابی سلمہ کی یہ روایت بیان کی کہ فلاں شخص یعنی خلفاء بنی امیہ کے ایک خلیفہ نے سعید بن عبدالملک کو وہ زمین بطور اقطاع (جاگیر) دی تھی، جس پر انہوں نے فرات سے نہر نکالی۔ وہاں پہلے جنگل تھا جس میں درندے رہتے تھے۔ (ان خلیفہ نے) انہیں یہ زمین عطا کی اور انہوں نے نہر نکال کر اسے آباد کیا۔ اسی لئے اس نہر کا نام نہر سعید ہے۔

پھر ایک دو سطروں کے بعد عمر بن عبدالعزیزؒ کا تذکرہ کیا ہے کہ انہوں نے بھی اسی طرح "اقطاع" کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "رجلا من خلفاء بنی امیۃ" سے مراد عمر عبدالعزیزؒ نہیں ہیں بلکہ ان کے علاوہ کوئی دوسرے اموی خلیفہ ہیں۔ پھر ان کا نام لئے بغیر

---

(۱) موطا امام مالک باب المستکرھۃ من النساء

(۲) الاموال لابی عبید قاسم بن سلام زیر عنوان "اقطاع احد۔ خلفاء بنی امیہ۔ سعید بن عبدالملک" ص ۲۸۴ مطبوعہ مصر۔

ان کے عمل سے استدلال کے کیا معنی ؟ اس کی توجیہ یہی ہو سکتی ہے اور یہی صحیح ہے کہ مصنف اور اس دور کے جمہور علماء اہلسنت کے نزدیک سب خلفاء بنی امیہ ثقہ ' عادل ' فقیہ اور قابل اعتماد تھے ' اس لئے نام لینے کی ضرورت نہ تھی - رجاء بن ابی سلمہ نے ان کا نام لیا تھا مگر نعیم بن حماد کو یاد نہیں رہا - اور انہیں اس کی ضرورت بھی نہیں محسوس ہوئی -

زیاد بن ابی سفیان" مرحوم پر شیعہ اور شیعیت نواز (بقول ایک بزرگ "گلابی شیعہ" طعن و تشنیع کی بوچھار کرتے رہتے ہیں - لیکن امام شاطبی" ان کے ایک عمل سے استشہاد کرتے ہیں - موصوف اپنی مشہور و مقبول ' بلند پایہ تصنیف "الموافقات" میں سد ذرائع سے بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :-

"وقد عول العلماء على هذا المعنى وجعلوه اصلا يطرد ومطلوح الى سد الذرائع"

علماء نے اس معنی پر اعتماد کیا ہے اور اسے ایک مطرد قاعدہ اور سد ذرائع کے مقصد تک پہنچنے کے لئے ذریعہ بنالیا ہے

پھر اسی سلسلہ میں چند سطروں کے بعد اس کی مثالوں کے تذکرہ میں لکھتے ہیں :-

"وراعى زياد مثل هذا فى صلاة الناس فى جامع البصرة والكوفة فانهم اذا صلوا فى صحنه ورفعوا من السجود مسحوا جباههم من التراب فامر بالقاء الحصى فى صحن المسجد وقال: لست امن ان يطول الزمان فيظن الصغير اذا انشا ان مسح الجبهة من اثر السجود سنة فى الصلاة" (۱)

"زیاد نے جامع بصرہ و جامع کوفہ کے نمازیوں کے بارے میں اس اصول کی رعایت کی واقعہ یہ ہوا کہ لوگ جب ان مسجدوں کے صحن میں نماز پڑھتے تھے تو نماز سے فراغت کے بعد اپنی پیشانیوں پر ہاتھ پھیرتے تھے - یہ دیکھ کر زیاد نے صحن مسجد میں بجری بچھانے کا حکم دیا اس کی وجہ یہ بیان کی کہ کہیں نئی نسل کے بچے نماز کے بعد پیشانی پر مسح کو بھی سنت صلوۃ نہ سمجھ لیں"۔

امام شاطبی رحمہ اللہ کے ایسے جلیل القدر عالم دین اور محقق فقیہ کے اس بیان سے ایک طرف تو زیاد مرحوم کا تفقہ اور ان کی دینی بصیرت ' نیز حفاظت کے لئے ان کا اہتمام ظاہر ہورہا ہے اور دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہورہا ہے کہ امام شاطبی" اور ان کے دور کے

---

(۱) الموافقات فى اصول الشريعة للامام ابى اسحاق ابراهيم بن موسى الشاطبى الغرناطى رحمه الله القسم الرابع ج ۳ الفصل الخامس فى البيان والاجمال المسئلة السادسة

علماء و فقہاء کے نزدیک ان کی گورنری کا دور عدل و تقویٰ کا دور تھا جس میں شریعت کے نفاذ کے ساتھ ایسے بدعات اور کمی بیشی سے محفوظ رکھنے کا اہتمام عمال حکومت بھی کرتے تھے۔ اسی لئے وہ ان کے فعل کو بطور نظیر پیش کرتے ہیں۔ جو ایک درجہ میں دلیل کی حیثیت رکھتی ہے۔

واضح رہے کہ اسے صرف امام شاطبیؒ کی رائے نہیں کہا جاسکتا۔ موصوف زیاد کا عمل مذکور سد ذرائع کی مثال اور اس اصول پر مبنی احکام کے لئے ایک نظیر و دلیل کے طور پر پیش کررہے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے زمانہ کے جمہور علماء و فقہاء زیاد مرحوم کو معتمد علیہ' صالح' عادل' قابل اتباع اور ان کے دور کو عادلانہ دور سمجھتے تھے' ورنہ امام شاطبی رحمہ اللہ ان کے فعل سے استدلال نہ کرتے۔ بلکہ اس کا تذکرہ بھی اس مقام پر نہ کرتے۔ کسی کی مدح و ستائش تو آدمی ذاتی انفرادی رائے کی بناء پر ذکر کرسکتا ہے مگر کسی کے عمل کو بطور دلیل اور قابل اتباع نظیر اس وقت تک نہیں پیش کرسکتا' جب تک وہ دوسروں کو بھی تسلیم نہ ہو۔ اس سے عیاں ہے کہ اس وقت کے جمہور علماء و فقہاء اہلسنت زیاد مرحوم اور ان کے دور ولایت کے متعلق یہ حسن ظن رکھتے تھے۔

خلافت اسلامیہ کے ادوار

خلافت راشدہ' ایک خاص اصطلاح ہے جس کی تشریح ہم مودودی صاحب کے سوالات کے جوابات کے سلسلہ میں کرچکے ہیں۔ اس اصطلاح کے لحاظ سے حضرت معاویہؓ آخری خلیفہ راشد تھے۔ اور انہیں پر خلافت راشدہ کا خاتمہ ہوگیا۔

اگرچہ دور صحابہؓ تو ان پر ختم نہیں ہوا کیونکہ ان کی وفات کے بعد بھی ایک معتدبہ تعداد صحابہ کرامؓ کی خاصی مدت تک باقی رہی۔ مگر دور خلافت راشدہ ان پر ختم ہوجاتا ہے۔ کیونکہ ان کے بعد کوئی صحابی خلیفہ نہیں ہوا۔ (۱) ان کے بعد اندازا ۷۰' ۸۰ سال کا اموی دور کہلاتا ہے۔ اس کے بعد عباسی دور شروع ہوتا ہے' جو تقریباً ۵ صدیوں تک قائم رہا۔ ان کے علاوہ اندلس (اسپین یورپ) میں اموی عہدِ خلافت ہے جو تقریباً آٹھ صدیوں تک رہا۔

ہماری تاریخ اموی و عباسی ادوار کے ساتھ تو مخصوص نہیں۔ خلافت ترکیہ بھی مدت

---

(۱) حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت عام طور پر تسلیم نہیں کی گئی۔ بلکہ ایک چھوٹے سے علاقے تک محدود رہی۔ اس لئے ہم نے اس سلسلے میں ان کا تذکرہ نہیں کیا۔

دراز تک قائم رہی ' ہندوستان میں دولت مغلیہ وغیرہ کے ادوار بھی ہماری تاریخ کا جزو ہیں۔
لیکن دمشق ' بغداد اور اندلس کی خلافتوں کو پوری امت مسلمہ جانتی ہے' کیونکہ ان کا سرا اسلام کے اولین دور سے ملتا ہے۔ نیز یہ کہ انہوں نے پوری دنیا میں اسلام کا پیام پہنچایا ۔ اس لئے ان کا اثر عالمگیر ہوا ۔

علم دین اور دعوت اسلام کی اشاعت کرنا اس کی دعوت دینا ۔ احکام شرعیہ کا نفاذ کرنا اور ہدایات کتاب و سنت کی تعمیل کی ترویج کرنا ' اسلامی مملکت کے مقاصد ہیں ۔ دیکھنا یہ ہے کہ مذکورہ بالا ادوار خلافت میں یہ مقاصد کس درجہ میں حاصل ہوئے ؟

یہ واقعہ صرف اوراق تاریخ سے نہیں بلکہ تواتر سے ثابت ہے ' جس کا انکار تاریخ اسلام کا بڑے سے بڑا ناقد بھی نہیں کرسکتا ۔ کہ اموی و عباسی ادوار میں اسلام نور آفتاب کی طرح سرعت اور وسعت کے ساتھ پھیلا ۔ اور تھوڑی سی مدت میں مسلمانوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچ گئی۔ ترکستان ' چین ' افریقہ ' ہندوستان ' جاوا ' یورپ وغیرہ دنیا کے ہر متمدن خطے میں اسلام کا نور پہنچ گیا ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مسعود اور دور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے جو وراثت انہیں ملی تھی ' اسے انہوں نے اپنی کمائی سے اضعافاً مضاعفۃً کردیا۔ صرف مسلم مورخین نہیں بلکہ مسیحی مورخین بھی بیان کرتے ہیں کہ اسپین میں اموی فاتحین کے قدم پہنچتے ہی اسلام سیل رواں کی طرح پھیلنے لگا اور مسیحی جوق جوق حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے ۔ خلافت یزیدؒ کے دور میں افریقہ کے بربر قبائل تقریباً سب کے سب مشرف بہ اسلام ہوگئے ۔ ان کے علاوہ دوسرے لوگ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے ۔ ہندوستان میں غازی محمد بن قاسم رحمہ اللہ کے داخل ہوتے ہی اسلام پھیلنا شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے دور دور تک پھیل گیا ۔ اور اس خطے میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگئی ۔ اموی خلافت ختم ہونے کے بعد بھی اسلام کی روشنی پھیلتی رہی اور مسلمانوں کی تعداد بڑھتی رہی ۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء میں جب برصغیر کی تقسیم ہوکر پاکستان وجود میں آیا ہے تو سندھ میں مسلمان ۷۵ فیصد تھے ۔ یہ اموی لشکر ہی کی تبلیغ ان کے ایمان اور ان کی اخلاقی بلندی کا اثر تھا کہ ان کے چلے جانے کے بعد بھی اس سرزمین میں مدت دراز تک نور ہدایت پھیلتا رہا اور مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔

مختصر یہ کہ خلافت اسلامیہ کے ان دونوں مبارک ادوار میں اسلام کی اشاعت خوب ہوئی ' اور اتنی کثیر تعداد میں غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا کہ عقل حیران رہ جاتی ہے ۔ سوال یہ ہے کہ اگر ان ادوار کے حکمراں فاسق و فاجر اور ظالم و جابر تھے ۔ تو انہیں دیکھ کر

اتنے آدمی مشرف بہ اسلام کیسے ہوگئے ؟ اسلام کا عملی نمونہ دیکھے بغیر لوگوں کو اسلام کی طرف کشش اور رغبت کیسے ہوئی ؟ جبکہ ان نومسلموں میں ایک فی ہزار بھی ایسا نہ تھا جس نے اسلام کا مطالعہ کیا ہو ؟

ان مبارک ادوار میں دین حق کا اس تیزی کے ساتھ پھیلنا اور بکثرت غیر مسلموں کا شرح صدر کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہونا اس حقیقت کی واضح اور روشن دلیل ہے کہ یہ حکمران متقی، رعیت پرور اور اعلیٰ کردار رکھنے والے تھے۔ اور ان کے ادوار کی فضا اسلامی اور روح پرور تھی۔ جسے دیکھ کر غیر مسلموں کو اسلام کی طرف کشش اور رغبت ہوتی تھی اور وہ حلقہ بگوش اسلام ہوجاتے تھے۔

اگر ہماری تاریخ کی وہ تصویر صحیح ہوتی جو سبائی موقلم نے تیار کی ہے تو اموی و عباسی ادوار میں اسلام اس تیز رفتاری کے ساتھ نہ پھیلتا اور اتنی کثرت کے ساتھ لوگ مشرف بہ اسلام نہ ہوتے۔ ان خلفاء اسلام اور ان کے عمال وولاۃ نے خود اسلام کی دعوت دی، تاریخ شاہد ہے کہ ان ادوار، خصوصاً بنی امیہ کے مبارک دور خلافت میں فوج کے معمولی سپاہی بھی داعی الی اللہ ہوتے تھے اور غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ مسلمانوں کے اخلاق عالیہ، اعلیٰ کردار، مساوات، صداقت، عفت و پاکبازی، ان کی ذہنی و فکری بلندی و برتری، ان کے حکمرانوں کا عدل و انصاف ان کی رعیت پروری، اور وسعت قلبی و رحم دلی۔ یہ وہ چیزیں تھیں جن سے متاثر ہوکر کثیر تعداد میں لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے

خلافت عباسیہ کا دور بھی مبارک تھا۔ اس کا مبارک و مسعود ہونا بھی اسی طرح ثابت ہے۔ امام ابو حنیفہ، امام اوزاعی، امام مالک، امام ابو یوسف، امام محمد رحمہم اللہ کی ایسی عظیم شخصیتوں نے خلفاء عباسیہ اور ان کے عمال کے ساتھ تعاون کیا۔ ان خلفاء نے ان ائمہ فقہ اور دوسرے اکابر علماء کے مشورے سے حسب ضرورت قوانین ملکی مقرر کئے۔ باوجودیکہ خلافت عباسیہ کی تعمیر خلافت امویہ کے کھنڈر پر کی گئی تھی، مگر انہوں نے اموی خلفاء کی عظمت و دیانت کا اعتراف کیا اور جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں، ان کے تعامل کو نظیر سمجھا اور اس کی اتباع کی۔ عباسی خلفاء کے اس طرز عمل کو ان کے عدل و انصاف، تقویٰ اور للہیت کی دلیل قرار دینا بالکل صحیح استدلال ہے۔

تاہم ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ عباسی دور خلافت بحیثیت مجموعی اموی دور خلافت کی بلندی کو نہیں پہنچتا۔ دونوں دور مسعود تھے، اور دونوں کی خلافت موعودہ انعامی خلافت تھی۔ مگر دونوں کے درمیان درجہ اور مرتبہ سعادت کا فرق کرنا ناگزیر ہے۔ اس کی

وجہ بنی عباسؓ کی ایک غلطی تھی جو آخر کار ان کے زوال کا باعث بنی۔ انہوں نے شیعوں کے ساتھ اتحاد کیا اور حصول خلافت میں ان سے بھی اعانت حاصل کی۔ اس کی وجہ سے پیروان ابن سبا کا یہ گروہ کار خلافت میں دخیل ہوگیا۔ شیعہ عمال قصداً ایسے کام کرتے تھے جن سے نظام خلافت کو نقصان پہنچے۔ سنی عمال اور اہل کاروں کو بھی غلط راستوں پر ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ مامون و معتصم پر ان کا جادو زیادہ موثر ہوا۔ انہوں نے ان دونوں کو ورغلا کر اہلسنّت خصوصاً حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی مخالفت پر ابھارا۔ اس سے خلافت عباسیہ کی شہرت کو نقصان پہنچا۔ اس حادثہ فاجعہ میں بڑا دخل معتصم کی بیوی کو تھا جو شیعہ تھی۔ امیر المومنین ہارون الرشید رحمہ اللہ نے خلافت کو روافض سے پاک کرنے کی کوشش کی جو ایک حد تک کامیاب بھی ہوئی، مگر پورے طور پر کامیاب نہ ہو سکی۔ ایک مدت کے بعد یہ منافق پھر دخیل ہوگئے۔ اور بالآخر ان دوست نما دشمنان اسلام نے یہود، اور تاتاریوں کے تعاون سے خلافت عباسیہ کو تباہ کرکے چھوڑا۔

مامون و معتصم کے زمانہ میں جو بلا نازل ہوئی وہ درحقیقت جمہور اہل سنت خصوصاً ان کے قائدین کی غلطی کا نتیجہ تھی۔ اگر وہ شیعوں سے میل جول نہ بڑھاتے، اور شیعہ پروری و شیعیت نوازی نہ کرتے تو شیعہ حکومت اسلامیہ میں اس قدر دخیل نہیں ہوسکتے تھے۔ معتصم شیعہ عورت سے شادی کرنے کی جسارت نہ کرتا۔ مامون خلیفہ نہ ہوتا اگر ہوتا بھی تو پورا سنی ہوتا۔ اور یہ افسوسناک واقعات نہ پیش آتے۔ مامون کے شیعی رجحانات معلوم تھے۔ اور صاف نظر آرہا تھا کہ اگرچہ وہ پورا شیعہ نہیں ہوا ہے مگر شیعی تحریک میں شریک ہوگیا ہے۔ پھر جمہور اہلسنّت نے جن میں علماء و صلحاء بھی شامل تھے۔ اسے خلیفہ کیوں بنایا؟ امین کے مقابلے اس کی مدد کیوں کی؟ اگر اس کا تشیع پہلے مخفی تھا تو ظاہر ہونے کے بعد اسے معزول کیوں نہ کیا؟ وہ جب کلیدی مناصب اور اہم خدمات پر شیعوں کو مقرر کررہا تھا تو اس پر نکیر کیوں نہیں کی اور اسے اس سے روکنے کی کوشش میں کیوں کوتاہی کی؟ معتصم کے بارے میں بھی اس وقت کے جمہور اہلسنّت پر یہی اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔

جمہور اہل اسلام اور علماء کرام اور قائدین امت کی ان غلطیوں کی وجہ سے خلافت کی برکتوں میں کمی ہوئی اور مامون و معتصم کو اہل سنت کی سربراہی اور ان کے سر پر مسلط ہوکر انہیں اذیت و نقصان پہنچانے کا موقع ملا یہ اپنا ہی کیا ہوا۔ اور جمہور کا قصور تھا۔ اس کی سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی مگر پھر بھی یہ کرم ہوا کہ انعام خلافت ضبط نہیں کیا گیا اور اصلاح کا موقع دیا گیا۔ ان واقعات سے جو جمہور اہل سنت کی غلطی کا نتیجہ تھے یہ لازم

نہیں آتا کہ عباسی خلافت موعودہ انعامی خلافت نہ تھی وہ یقیناً موعودہ انعامی خلافت تھی۔
جمہور نے جب اس کی ناقدری کی تو اس کی سزا انہیں ملی۔

قرآن و سنت کی روشنی میں تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہوجاتی ہے کہ ہماری تاریخ بہت قابل تحسین بلند پایہ، اور مثالی تاریخ ہے۔ دور خلافت راشدہ کی عظمت کا تو پوچھنا ہی کیا۔ ان کے بعد دمشق، بغداد اور اندلس کی خلافتیں بھی بہت قابل تحسین اور مسلمانوں کے لئے قابل فخر ہیں۔ جمہور اہل سنت اور اور جمہور علماء و فقہاء اہل سنت اخبار متواترہ کی بناء پر یہی رائے رکھتے ہیں۔ شیعوں اور شیعیت سے متاثر سنی مورخین نے اسلامی تاریخ پر جو سیاہی پھیرنے کی کوشش کی ہے، کبار علماء اہلسنت نے جو مورخ بھی تھے پوری قوت سے اس کی تردید کی ہے۔ اور اس تردید کو بہت اہم کام سمجھا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو شیخ عبدالعز حنفی رحمہ اللہ اپنی کتاب شرح العقیدۃ الطحاویہ، میں "خلفاء اثنا عشر" کے متعلق حدیث کی شرح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :-

"وهو ماخر جاه في الصحيحين عن جابر بن سمرة دخلت مع ابي على النبي صلى الله عليه وسلم فسمعته يقول "لايزال امرالناس ماضيا وليهم اثنا عشر رجلا ثم تكلم النبي صلى الله عليه وسلم بكلمة خفيت عليّ فسالت ابي ماذا قال النبي صلى الله عليه وسلم قال "كلهم من قريش" وفي لفظ : لا يزال الاسلام عزيزا الى اثنى عشر خليفة". وكان الامر كما قال النبي صلى الله عليه وسلم و الاثنا عشر الخلفاء الراشدون الاربعة و معاوية وابنه يزيد و عبدالملك بن مروان واولاده الاربعة و بينهم

اور وہ (حدیث ہے) جس کی تخریج (بخاری و مسلم نے) صحیحین (صحیح بخاری و صحیح مسلم) میں حضرت جابرؓ بن سمرہ سے کی ہے کہ میں اپنے والد کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "لوگوں کا (خلافت کا) کام ہوتا رہے گا۔ چنانچہ ان پر بارہ اشخاص حکومت کریں گے پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی بات فرمائی جو مجھ سے مخفی ہوگئی۔ تو میں نے اپنے والد صاحب سے پوچھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا تھا؟ انہوں نے بتایا کہ یہ فرمایا تھا کہ "سب کے سب قریش میں سے ہوں گے"۔ یہ حدیث دوسرے الفاظ میں یوں ہے: "اسلام بارہ خلفاء کی خلافت تک غالب رہے گا" اور وہی واقع بھی ہوا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ

عمر بن عبدالعزیز ثم اخذ الامر فی الا نحلال وعند الرافضة " ان امرا الامة لم یزل فی ایام ھؤلاء فلسدا منغصا یتولی علیھم الظالمون المعتدون بل المنافقون الکافرون واھل الحق اذل من الیھود" وقولھم ظاھر البطلان ' لم یزل الاسلام عزیزا فی ازدیاد فی ایام ھؤلاء الاثنی عشر" (ص ۵۵۲ و ۵۵۳)

وسلم نے ارشاد فرمایا تھا۔ اور خلفاء اثنا عشر میں :۔

چاروں حضرات خلفاء راشدین ' حضرت معاویہؓ اور ان کے بیٹے یزید" عبدالملک بن مروان

اور ان کے چاروں بیٹے ۔ اور ان کے درمیان عمر بن عبدالعزیز ہیں اور روافض کے نزدیک "امت کا حال ان خلفاء کے زمانہ میں فاسد اور گدلا رہا ان پر حد سے تجاوز کرنے والے ظالم مسلط رہے بلکہ منافق کافر مسلط رہے ۔ اور اہل حق یہود سے بھی زیادہ ذلیل رہے" (رافضہ کا قول ختم ہوا) "اور ان کا (روافض کا) یہ قول واضح طور پر باطل ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان بارہ خلفاء کے زمانہ میں اسلام برابر معزز رہا اور برابر ترقی کرتا رہا۔"

تنبیہ :۔

ہم نے اس سلسلہ میں خلافت اندلس کا تذکرہ اتنی تفصیل کے ساتھ نہیں کیا جتنا تفصیلی تذکرہ خلافت دمشق و بغداد کا کیا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں خلافتوں پر شیعوں اور شیعیت زدہ سنی لوگوں نے حملے زیادہ کئے ہیں۔ اسپین کی خلافت بھی بہت مبارک ' باعظمت اور مثالی تھی ۔ وہ بھی خلافت موعودہ ہی کا ایک حصہ تھی ۔ لیکن ان لوگوں نے اسے مخصوص طور پر مطاعن کا ہدف نہیں بنایا ۔ نیز اس کی ابتداء بھی دور صحابہؓ کے بعد ہوئی اس لئے اس کا مختصر تذکرہ کافی سمجھا گیا ۔ خلافت ترکیہ کا بھی ہم نے تذکرہ نہیں کیا کیونکہ وہ اس دور سے متصل نہیں تھی ۔ نیز اسے بھی شیعوں نے مخصوص طور پر ہدف طعن نہیں بنایا ۔ مگر یہ واضح رہے کہ شیعوں اور یہود کو عداوت اور دشمنی ان دونوں خلافتوں سے بھی ہے ۔ بلکہ انہیں ہر اسلامی سلطنت سے عداوت ہے ۔ اور ان دونوں خلافتوں کا زوال بھی یہود اور شیعوں کی متفقہ سازشوں اور فریب کاریوں سے ہوا ۔ بلکہ چودہ صدیوں میں جتنی اسلامی سلطنتیں زوال پذیر ہوئیں کم از کم ان میں سے بیچارے فیصد کے زوال میں شیعوں کا ہاتھ ضرور رہا ہے۔